اِک چُپ، سو دُکھ

آدم شیر

اِک چُپ، سو دُکھ

آدم شیر

کتاب	اِک چُپ، سو دُکھ
مصنف	آدم شیر
صفحات	176
پروف ریڈنگ	عمیرہ احمد
سن طباعت	2019ء
قیمت	400
تعداد	500

AKSPUBLICATIONS
Book Street, Data Darbar Market, Lahore.
Ph:042-37300584,Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com

انتساب

والد حارث الحراث

اور

والدہ میمونہ تبسم

کے نام

فہرست

دُبدھا

راجہ شیر سنگھ کی بارہ دری، بارہ دری کے قریب بچوں کا سکول، سکول کے قریب خون کی چھپڑی، چھپڑی میں کانے سوئیاں گھماتے چار بجے مجھے کام پر جانے سے روک نہ سکے۔ مَیں نے گزرتے گزرتے دیکھا اور سوچتے سوچتے گزر گیا کہ خدا معلوم کس نے صدقہ دیا ہے۔

دفتری الجھنوں میں الجھ کر مجھے یاد بھی نہیں رہا کہ وہ بچے منجمد ہوتے خون سے کھیل رہے تھے اور گھر آ کر گھریلو الجھاوؤں میں بھی یاد نہیں آیا کہ چار بچے منجمد ہوتے خون سے کھیل رہے تھے اور یاد آتا بھی کیسے کہ مَیں خون دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں، شاید۔ مَیں ایک نام نہاد صحافی ہوں اور صحافی نہ بھی ہوتا تو خون دیکھنے کا عادی ہو جاتا، شاید، کیونکہ جہاں مَیں رہتا ہوں وہاں بڑے بڑے عادی ہو جاتے ہیں۔ یوں بھی جب غیر معمولی بات معمول بن جائے تو غیر معمولی کہاں رہتی ہے۔

جب میں رات کا کھانا کھا چکا تو چائے کے انتظار میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر سگریٹ سلگا کر دھواں اڑانے لگا۔

ہسپتال کے ایک کمرے میں مریض لاوارث پڑا نظر آ رہا ہے۔ مریض کے بستر سے دو فٹ کے فاصلے پر پینٹ کوٹ میں ملبوس مشہور اداکار گول گول گھومنے والی کرسی پر بیٹھا قہقہہ لگا کر کہتا ہے کہ فلاں کمپنی سے انشورنس کراتے تو یہ حال نہ ہوتا ہے۔

مَیں نے چینل بدلا اور چالیس پچاس برس پرانی سست رو فلم دیکھتے دیکھتے سو گیا، یاد نہیں کہ کوئی برا بھلا خواب بھی دیکھا یا نہیں البتہ اگلے دن حسب معمول دیر سے جاگا اور

جب ناشتہ کرنے لگا تو ٹی وی پر خبریں سنتے ہوئے اماں نے پوچھا کہ بیٹا ہمارے محلے میں ہوئے قتل کی خبر کیوں نہیں ٹی وی پر آئی؟ تمہارے اخبار میں بھی نہیں چھپی۔ ’’میں نے حیرانی سے پوچھا کہ کونسا قتل؟ کس کا قتل؟ کب ہوا قتل؟ اور اماں نے بتایا کہ سکول کے پاس ایک آدمی کو دوسری شادی سے خائف پہلی بیوی نے قتل کرا دیا ہے۔

اوہ خدایا! تو وہ چار بچے جس منجمد ہوتے خون سے کھیل رہے تھے، وہ ایک انسان کا خون تھا۔ دھت۔ یہ کیا ہوا۔ ایک انسان کا خون ہوا، بچوں کے سکول کے باہر، اور دو دن بعد بھی وہیں پڑا تھا۔ اس کے گرد اینٹوں کا بند بنایا گیا تھا اور وہ وہیں موجود تھا دو دن بعد بھی، اور چار بچے اُس منجمد ہوتے خون سے کھیل رہے تھے۔

پولیس نے اُس ایک فٹ چوڑی دو فٹ لمبی ایک انچ گہرائی والی چھپڑی میں سے دو دن بعد کیا نکالنا تھا؟ چھوٹے چھوٹے بچوں کے بڑے سے سکول والے کہاں سوئے مرے تھے اور آس پاس کے گھروں والے کدھر خاک چھان رہے تھے؟

میرے منتشر الخیال ذہن میں اور بھی کئی خیال آتے مگر بیوی نے یاد دلایا کہ جلدی سے نہالوں ورنہ پانی چلا جائے گا۔ یوں میں سدھایا ہوا آدمی سیدھا غسل خانے میں گھسا اور منتشر خیالات کے ساتھ نہا کر باہر نکلا تو آگے ننھا فرشتہ منتظر تھا۔ حارث کے ہاتھ میں تولیہ تھا اور لبوں پر ’بابا ٹولا، بابا ٹولا‘۔۔۔ میں نے تولیہ لے کر کندھے پر ڈالا اور اکڑوں بیٹھ کر مسکراتے چہرے کو مسکرا کر دیکھا تو حارث نے جھٹ سے کہا، ’’کہو چھا باچھ، بابا چھا باچھ‘‘، اور میں نے شاباش کہتے ہوئے تالی بجائی اور لختِ جگر کی آنکھوں میں جھانکا اور تبھی نہ جانے کیوں مجھے وہ چار بچے یاد آ گئے جو منجمد ہوتے خون سے کھیل رہے تھے مگر میں نے اُنھیں ذہن سے جھٹکا اور اپنے بچے کو سینے سے چمٹا لیا اور ٹی وی کے سامنے دوبارہ جا بیٹھا جہاں اس وقت ایک دلچسپ فلم دکھائی جا رہی تھی۔

فلم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ کام پر جانے کا وقت ہو گیا سو بندۂ مزدور نکل پڑا اور دفتری

ذمہ داریاں ۔۔۔ وہ بھی ایسی کہ کیسی کیسی بھیانک باتیں سامنے آتی ہیں اور جب ہم سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے تو وہی باتیں ہمیں کھانے لگتی ہیں یا وہی کچھ مان لینے یا کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ان باتوں کے متعلق مزید بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی بھی دن کا اخبار خرید کر دیکھی پڑھی جا سکتی ہیں بلکہ اخبار خریدنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جاننے والے جان سکتے ہیں کہ داخلی اور خارجی زندگی میں خلیج خلل نہیں پیدا کرے گی تو اور کیا کرے گی؟

خلل سے بچاؤ کے لیے مختلف لوگ مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں جن میں سے کچھ کام کر جاتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے اور بہتوں کو خلل کے متعلق معلوم ہی نہیں ہو پاتا اور وہ خلا چھوڑ جاتے ہیں۔ مجھے بھی ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ خلل سے کہاں تک بچ پایا مگر یہ خدشہ ضرور لاحق ہو گیا کہ یہ جگہ رہنے لائق نہیں رہی جہاں میں رہتا ہوں مگر سوال یہ ہے کہ یہاں نہ رہوں تو کہاں رہوں؟ میرے لیے جگہ ہے کہاں؟ اور اگر کہیں ملے گی تو کیا وہ مختلف بھی ہوگی؟ اس سے مختلف تو ہونی چاہئے کہ یہاں بچے بچے نہیں رہتے۔

زیادہ پرانی بات نہیں کہ ایک رات بجلی گئی ہوئی تھی اور مَیں چھت پر سو رہا تھا مگر اچانک آنکھ کھل گئی۔ یہ جملہ یوں تو بہت عجیب معلوم پڑتا ہے کہ اچانک آنکھ کھل گئی مگر ہوتا اسی طرح ہے۔اب دیکھیں آدمی سانس لے رہا ہے اور اچانک سانس نہیں لے پاتا۔اسی طرح نیند میں ہوتا ہے اور اچانک جاگ جاتا ہے، تو مَیں یوں جاگا جوں گرم پانی کی بالٹی مجھ پر انڈیل دی گئی ہو۔

ہماری گلی میں ایک لڑکا ایسا ہے جیسے سپیشل قرار دیے گئے چلڈرن ہوتے ہیں۔اُس کا سر یہ بڑا سا کدو کی طرح اور جسم چھوٹا سا بڈاوے کی طرح، نام اس کا۔۔۔نام جو بھی ہو، کیا فرق پڑتا ہے کیونکہ ایسے بچوں کو ہمیشہ ایسے ویسے ناموں سے پکارا جاتا ہے بالخصوص ایسی جگہوں پر جیسی جگہوں پر میں رہتا ہوں تو اسے بھی لوگ برے برے ناموں سے پکارتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے ماں باپ بھی سیدھے نام سے کم کم بلاتے ہیں۔

اگر آپ گھر میں دبکے رہنے والے آدمی نہیں تو آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ ایسی جگہوں پر ایسے بچوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ زیادہ ہوتی ہے اور وہ لڑکے جو سپیشل چلڈرن کے زمرے میں نہیں آتے، موخر الذکر کے ساتھ جنسی تسکین کا کچھ سامان پیدا کرنے کی کوشش بھی کر لیتے ہیں، اور کچھ نہ ہو تو زبانی کلامی ہی سہی۔۔۔اِس لڑکے کو بھی اسی طرح تنگ کیا جا رہا تھا جبھی وہ گالیاں بک رہا تھا مگر شور سن کر کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی حالانکہ ان گلیوں میں چھتیں چھتوں سے جڑی ہوتی ہیں۔ کہنا نہیں چاہئے مگر سچ یہی ہے کہ مجھے ہیرو بننے کا شوق تو بہت ہے مگر کبھی ہمت نہیں ہوئی تھی سو جی کو تسلی دی کہ ابھی کوئی نہ کوئی حرکت میں آجائے گا اور معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ یہ حرکت کتنی دیر میں ہوئی، ہوئی بھی کہ نہیں مگر مَیں یہ سوچ کر سو ضرور گیا تھا کہ کچھ نہیں ہوتا یعنی کیا فرق پڑتا ہے۔

یہ جملہ بھی کم دلچسپ نہیں کہ کیا فرق پڑتا ہے کیونکہ یہ فقرہ وہی کہتے ہیں جنہیں فرق پڑتا ہے سو مجھے بھی فرق پڑا کہ میرا بھی ایک بچہ ہے جو رات کو میری گھر واپسی پر ماں کے ساتھ دروازہ کھولتا ہے اور 'بابا، بابا' کہتے میری ٹانگوں سے چمٹ جاتا ہے، میری بائیک کے ہینڈل پر لٹکا لفافہ دیکھ کر پوچھتا ہے کہ ''یہ کیا؟''، پھر کہتا ہے، ''یہ اٹھانا''، اور مَیں اُسے لفافہ پکڑا دیتا ہوں، وہ میرے آگے آگے چلتا ہے اگرچہ لفافہ کا بوجھ سہار نہیں پاتا اور کبھی ایک ہاتھ، کبھی دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتا ہے مگر ننھے منے بازو چند فٹ کا فاصلہ طے کرنے میں تھک جاتے ہیں اور وہ لفافہ زمین پر رکھ دیتا ہے اور ہاتھ ملتا ہے۔ میں بھی وہیں بیٹھ جاتا ہوں تو وہ کہتا ہے، ''بھلا بھالی''، مَیں مسکراتا ہوں اور اُس کا ماتھا چوم لیتا ہوں اور اُس جہان میں پہنچ جاتا ہوں جہاں روح کے گھاؤ بھرتے ہیں مگر۔۔۔مگر یہ کیا کہ خیال کے اندھیارے میں چار بچے منجمد ہوتے خون سے کھیلتے اور پانچواں بچہ ظلمت نیم شب میں گالیاں بکتا آجاتا ہے اور میری روح فنا کی قطار پر پہنچ جاتی ہے۔

تنگ، بند، ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں مجھے اپنے بچے کا مستقبل بھی ٹیڑھا میڑھا محسوس

ہوتا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ کہیں مجھے وہاں گھر مل جائے جہاں میرا ایک نالائق دوست رہتا ہے جو میری طرح نام نہاد صحافی نہیں اور اُس کا گھر وہاں ہے جہاں تیس تیس فٹ چوڑی گلیاں ہیں، گھروں کے باہر چھ چھ فٹ چوڑی کیاریاں ہیں، ہر گلی کے کونے پر باغ ہے اور باغ میں جھولے جھولتے بچے جن پر دادا نانا نگاہیں جمائے گپیں ہانک رہے ہوتے ہیں اور......اور اِدھر پرانے شہر میں کمرے سے نکلو، گھر ختم مگر یہ بھی یاد رہتا ہے کہ یہاں آدھی سے زیادہ آبادی کے پاس اپنا کوئی گھر نہیں۔ میرے پاس گھر ہے تو سہی، ایک کمرے کا ہی سہی مگر 'چین یکی تے نوکری پکی' ایسالا جواب جملہ گھڑنے والے میرے نالائق دوست کا گھر جہاں ہے وہاں دن کو جاؤ، رات کو جاؤ، سکون کا احساس، ہریالی دماغی خلیوں پر مثبت اثرات چھوڑتی ہے، سو دو سو فٹ کے فاصلے پر بہتی نہر لاہور جس کے کناروں پر پیڑ آپس میں یوں سر جوڑے کھڑے ہیں جوں مقتول ساتھیوں کا سوگ منا رہے ہوں یا نہر کو نظرِ بد سے بچا رہے ہوں یا آتے جاتے لوگوں کی چغلیاں کر رہے ہوں یا اس گندگی سے بچاؤ کا طریقہ ڈھونڈ رہے ہوں جو نہر میں بہا دی جاتی ہے جو ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی کو نظر نہیں آتی مگر مجھے نظر آتی ہے اور اس کے باوجود جب نہر سے ہوائیں چھن کر آتی ہیں تو تازگی کا احساس جگاتی ہیں، خیال کی دنیا میں پہنچاتی ہیں جو کالے جنگل کی طرح ہے جس میں پیڑ کسی ترتیب کے بغیر اُگے ہوئے ہیں اور انہی پیڑوں کی بھول بھلیوں سے راستہ ملنا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں راستہ ڈھونڈ پاتا میرا بیٹا بھاگا بھاگا آیا اور 'میلے پیشے، میلے پیشے' کہنے لگا اور جب میں نے پیسے دیے تو بولا 'تھینک یو'، اور میں یوں نہال ہو گیا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا، سچے سُر کی طرح، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اُس کا یہ انداز بہت دلچسپ ہے کہ میلی جیجی، میلے پیشے، میلے بابا، میلی ماما، میلا غبارہ، جو بھی ہو میلا پہلے لگاتا ہے۔ اس سے مجھے امید بندھتی ہے کہ وہ اپنا راستہ آپ نکال لے گا لیکن میرا بھی تو کچھ فرض ہے، ہے کہ نہیں؟ اور مجھے یہ احساس ستانے لگا کہ میں اپنا فرض ٹھیک ٹھیک نہیں نبھا رہا۔ مجھے اس دنیا

کے لیے محنت کرنی چاہیے جو میرے بچے کے لیے رہنے لائق ہو مگر میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں!

یہ سوال میں ہر روز رات کو سونے سے پہلے ننھے منے حارث کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے خود سے پوچھتا، کبھی مجھے جواب ملتا کہ مجھے ڈھیر سارے پیسے کمانے چاہئیں، کسی بھی طرح مگر۔۔۔اور اسے کسی اچھی آبادی میں آباد کرنا چاہیے جہاں وہ اچھے بچوں کے ساتھ اچھے سے پروان چڑھے مگر بچے تو سارے اچھے ہوتے ہیں، برا تو ہم بناتے ہیں۔ ہاں ہم اُنھیں برا بنا دیتے ہیں، بہت برا بنا دیتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ دنیا برے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

کبھی میں سوچتا کہ اچھی سے اچھی آبادی میں پروان چڑھے بچے بھی اسی دنیا کا سامنا کرتے ہیں لٰہذا یہ کوئی حل نہیں۔ ہاں یہ کوئی حل نہیں۔ مجھے اپنے بچے کو مضبوط بنانا چاہیے تا کہ وہ اس بری دنیا کا سامنا کر سکے جسے ہمارے بڑوں اور ہم نے برا بنایا۔

کبھی مجھے شبہ ہوتا کہ میری میٹرک پاس بیوی میرے بچے کی پرورش صحیح نہیں کر پائے گی۔ ہم ایک دوسرے کے الٹ ہیں۔ وہ عقائد کی پکی اور مَیں جو بات سمجھ میں آئے، وہی ٹھیک۔ مجھے یہ گمان بھی رہا کہ کچھ باتوں تک ہماری سوچ ابھی پہنچ نہیں پائی سو امکانات کے در کھلے رکھنے چاہئیں۔ یوں بھی ایک وقت میں سکے کا ایک رخ واضح نظر آتا ہے، دوسرا دیکھنے کے لیے سکہ الٹانا پڑتا ہے۔ خیر یہ بے ترتیب خیالات تو ایویں ہیں اگر چہ یہ مجھے کسی اور کی یاد دلاتے ہیں جو کہتی تھی کہ ہم میں کچھ بھی کامن نہیں، جو کہتی تھی کہ سچ ادھورا نہیں ہوتا، ادھوری ہماری بصیرت، ادھوری ہماری بصارت، ادھورے ہمارے محسوسات اور ادھورا ادھورا کرتے وہ مجھے بھی ادھورا چھوڑ گئی تھی۔ جب وہ بہت بہت دور جانے لگی تھی تو اُس نے کہا تھا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''کیا فرق پڑتا ہے؟''

واقعی کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ سوال ایک عرصہ میرا پیچھا کرتا رہا اور مَیں یہی کہتا رہا کہ فرق تو پڑتا ہے مگر کیا کیا جا سکتا ہے؟ یہ کلیہ اچھا ہے مگر مَیں بچے کے معاملے میں اس کلیے کے باوجود طرح طرح کے وسوسوں سے بچ نہ سکا کہ میری بیوی اُسے اتنا مضبوط نہیں بنا پائے گی کہ وہ طاقتور کی بقا کے گھٹیا قانون کی پاسداری کر سکے یا وہ اُسے کنویں کا مینڈک نہ بنا دے یا اُس کی سوچ پر تقدس کے پہرے نہ بٹھا دے یا خوف کا کڑا نہ پہنا دے۔ کبھی مَیں بھاشن دیتا تھا کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنا ضروری نہیں بلکہ ہماری چال ایسی ہونی چاہئے کہ زمانہ چلے مگر جب اپنے پر پڑتی ہے تب سب گڑبڑا جاتا ہے۔ میں بھول جاتا کہ میری اماں بھی رسمی پڑھی لکھی نہیں تھی مگر لوک دانش اللہ اللہ۔۔۔ کیا انھوں نے میری تربیت صحیح نہیں کی؟ کیا انھوں نے مجھے صحیح اور غلط میں فرق کرنا نہیں سکھایا؟ کیا انھوں نے اپنے حق کے لیے ڈٹ جانا نہیں سکھایا؟ اگرچہ جوں جوں عمر کٹتی گئی، کم ہمتی بڑھتی گئی۔

میرے ابا جو بہت پڑھے لکھے تھے، جنہیں دنیا سے جانے کی بہت جلدی تھی، کیا مجھے قربانی دینا نہیں سکھا پائے؟ چھوٹی باتوں کو بڑا بنانے سے روک نہیں پائے؟ یقیناً وہ بھی کبھی سوچتے ہوں گے کہ یہ دنیا میرے بیٹے کے رہنے لائق نہیں جبھی وہ مجھے قصے سنایا کرتے تھے، دنیا جہان کے قصے، سوچتا ہوں کہ وہ متضاد قصوں سے شاید توازن لانا چاہتے تھے اور اِک چاند چہرہ کہتی تھی کہ توازن ہی حسن ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی آ جاتا ہے کہ انھی قصوں کا کیا دھرا ہے کہ میں اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا۔۔۔ یعنی دین کا رہا نہ دنیا کا۔۔۔ یعنی مقبول عام قول کے مطابق سوچی پیاتے بندا گیا۔ جہاں قول اس طرح کے ہوں وہاں سوچنے والوں کے متعلق کیا سوچا جاتا ہوگا، بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

پھر۔۔۔ پھر کیا کروں؟ مجھے ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو سکا کہ کیا کروں مگر خواب عجیب عجیب آنے لگے۔ ایک بار تو حد ہو گئی مگر سمجھ نہیں آ رہی کہ شروع کہاں سے کروں، چلیں شروع سے شروع کرتا ہوں کہ ایک روز میری آنکھ کھلتی ہے اور میں وہاں نہیں جہاں میں تھا۔

میں آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور ارد گرد نگاہ دوڑاتا ہوں مگر کچھ دیکھ نہیں پاتا کہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ دُور دُور تک کیا دیکھنا ہے، آس پاس ہی کچھ نظر نہیں آ رہا سو ہاتھوں سے محسوس کرتے ہوئے چلتا ہوں اور چلتا چلا جاتا ہوں۔ چلتے چلتے دکھائی دینے لگتا ہے اور دیکھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں، عمارتوں کا ملبہ گلیوں میں بکھرا، اور نہ کوئی بندہ نہ بندے دی ذات۔۔۔ پھر آنکھیں ملتا ہوں کہ کہیں یہ خواب تو نہیں؟ مگر یہ خواب نہیں۔

پھر چلتا ہوں اور چلتے چلتے ایسی جگہ پہنچ جاتا ہوں جہاں زندگی کی تھوڑی سی رمق محسوس ہوتی ہے ایک ڈھیری میں۔ جی ہاں۔ ڈھیری۔۔۔ میرے قدموں کی آواز سے ہلچل ہوتی ہے اور کالی ڈھیری سے دودھیا چہرہ نمودار ہوتا ہے جو گردِ زمانہ سے دودھیا نہیں لگتا مگر میری آنکھوں سے دھول کی پرتیں چاند سا چہرہ چھپا نہیں پاتیں اور میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ یہاں کیسے؟ اور حوصلہ ہوتا ہے کہ میں اکیلا نہیں۔

اُس کے چہرے پر خوف، آنکھوں میں پُر خوف حیرانی اور بھنچے ہونٹوں میں سوال دبے ہوئے ہیں۔ میں اپنے تئیں ہاتھ سے اشارہ کرتا ہوں کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں اور قدم قدم آگے بڑھتا ہوں مگر ڈر اس کے چہرے پر قائم رہتا ہے اور وہ پیچھے ہٹتی اٹھ بیٹھتی ہے تب میں وہیں رُک جاتا ہوں جہاں میں ہوں اور ہم کچھ لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں جیسے جانچ رہے ہوں۔ پھر اس کے ہونٹ وا ہوتے ہیں اور دبی دبی آواز مجھ تک پہنچتی ہے۔

کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو؟

کون ہوں میں؟ اس کا جواب مجھے بھی معلوم نہیں اور یہ بھی علم نہیں کہ یہاں کیسے آیا۔ اپنے گھر میں سویا ہوا تھا اور یہاں اندھیری جگہ جاگا ہوں۔

میری بات سن کر اس کے چہرے پر عجب مسکراہٹ پھیل جاتی ہے مگر جلد حیرانی ابھر آتی ہے اور وہ خود کو سہارتی کھڑی ہو جاتی ہے اور مجھے دوبارہ اوپر سے نیچے تک دیکھتی ہے

اور کچھ کہے بغیر منہ موڑ کر چل دیتی ہے۔ میں بھی قدم اٹھاتا ہوں اور ہم بہت دیر آگے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ میں بار بار پوچھتا ہوں کہ کہاں جا رہے ہیں مگر وہ کچھ نہیں کہتی اور میں بھی خاموش ہو جاتا ہوں۔

عجب عالم ہے کہ میں یہاں اپنی موجودگی کا سبب نہیں جانتا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کونسی جگہ ہے ۔۔۔؟ مگر اہم بات یہ ہے کہ اب میں یہاں ہوں تو کیا کروں؟ ابھی تو دیکھ رہا ہوں کہ یہ بستی جس کی بربادی سے کبھی آبادی کا پتا چلتا ہے، کیونکر تباہ ہوئی ؟ اور ایسی تباہ ہوئی کہ صرف ایک عورت بچی۔ مَیں نے ایک ہی دیکھی ہے، اگر کہیں کوئی اور ہو تو ہو، میں نے یہی ایک عورت دیکھی ہے جو دیکھتی ہے تو برقی رو کے بجائے سرد سی لہر دوڑا دیتی ہے۔

چلتے چلتے وہ اچانک رُک جاتی ہے، مڑ کر دیکھتی ہے کہ میں ہوں یا نہیں ہوں مگر میں ہوں اور اسے یوں دیکھتا ہوں جیسے بانو کو دیکھتا تھا اور وہ میرا دیکھنا اُسی کی مانند اَن دیکھا کرتی ہے اور چند قدم اٹھا کر ایک مکان میں گھس جاتی ہے جس کا دروازہ غائب ہے، دیواروں سے پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا ہے۔ وہ راہداری سے ہوتی ہوئی ایک کمرہ چھوڑ دوسرے میں داخل ہوتی ہے اور پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے۔ میں سامنے دیوار کے ساتھ پڑی ٹوٹے بازو والی کُرسی پر اپنا بوجھ ڈال دیتا ہوں۔

میں اُسے دیکھتا ہوں اور وہ مجھے مگر ہم کچھ نہیں بولتے۔ چند ساعتیں گزرنے کے بعد وہ آنکھیں بند کر لیتی ہے اور دوبارہ پوچھتی ہے۔

کون ہو تُم؟ کہاں سے آئے ہو؟ پہلے کبھی نہیں دیکھا؟ ایک عرصے سے کسی کو نہیں دیکھا۔

میں کون ہوں؟ پھر سوچ میں پڑ جاتا ہوں اور اُسے بھی جواب کی جلدی نہیں سو سوچتا رہتا ہوں اور جب سوچتے سوچتے تھک جاتا ہوں تو گویا ہوتا ہوں۔

نہیں جانتا کون ہوں میں۔ یہ جانتا ہوں کہ میں جہاں سے آیا ہوں وہ جگہ ناقابل

بیان ہے۔تم بتاؤ،تم کون ہو؟اوراس بستی کو کیا ہوا؟

یہ بھی نا قابل بیان بستی ہے جس میں بیانیے بہت بڑھ گئے تھے۔

میں اس کے جواب پر حیران ہوتا ہوں کہ ہو نہ ہو یہ کوئی شاعرہ یا ادیبہ ہے جو بیانیہ تماشا سے واقف ہے۔

چلو بیان کرو پھر۔میں کوئی مصروف آدمی ہوں نہ معروف۔۔۔

کیا بیان کرنا ہے۔کوشش کرتی ہوں مگر میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میری باتیں بہتوں کو سمجھ نہیں آتی تھیں۔پھر لگ سمجھ گئی۔میری باتوں کو دیوانے کی بڑ سمجھنے والے خود دیوانے ہو گئے۔

اور میں چونک پڑتا ہوں کہ یہ لفظوں کا استعمال بھی میری طرح کرتی ہے۔یہ یقیناً تخلیق کار ہے۔یوں تو ہر عورت تخلیق کار ہوتی ہے مگر یہ فنکار معلوم دیتی ہے جو کوئی کوئی ہوتی ہے اگر چہ ہم روز روز سنتے ہیں کہ فلاں عورت بڑی فنکار ہے یا فلاں آدمی بڑا فنکار ہے، جہاں فنکاروں کے ساتھ ایسا تاثر وابستہ کر دیا جائے وہاں فنکاروں اور فن کا کیا حال ہوتا ہے، بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے مگر مَیں اپنے سامنے بیٹھی فنکار میں دلچسپی کا اظہار کرتا ہوں اور وہ بستر کے نیچے سے ایک تصویر نکال کر دیکھتی ہے اور کچھ لمحے کھو جانے کے بعد پوچھتی ہے۔

کیا تمہارے بیوی بچے ہیں؟

ہاں۔ہیں۔

کہاں؟

میرے گھر میں ہیں۔

اور تمہارا گھر کہاں ہے؟

میرا گھر اُس دنیا میں ہے جو بچوں کے رہنے لائق نہیں رہی جہاں بچوں کو ماں باپ

کے پیار کے سوا خالص کچھ نہیں ملتا، خوراک نہ صحت نہ تعلیم نہ یہ نہ وہ، اور میں اسی پریشانی میں جاگتا ہوں اور سوتا ہوں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ کیا جگہ ہے؟ جہاں مجھے کوئی آدمی نظر نہیں آیا تمہارے سوا اور تم۔۔۔ تم کون ہو؟

وہ تھوڑی دیر مجھے یوں دیکھتی ہے جیسے کہیں اور دیکھ رہی ہو، پھر کلام کرتی ہے۔

یہ جگہ بھی وہ جگہ ہے جو بچوں کے رہنے لائق نہیں رہی تھی۔ میں کہانیاں لکھ لکھ کر لوگوں کو بتاتی رہی کہ پھول توڑے جا رہے ہیں۔ پھول مسلے جا رہے ہیں مگر کسی نے میری بات پر دھیان نہیں دیا بلکہ میری ہنسی اڑائی گئی۔ اس بستی کے بڑے بڑے دانشوروں نے میری بات ہوا کر دی کہ ساری دنیا کے سارے ملکوں میں، سارے شہروں میں، سارے قصبوں میں، سارے دیہاتوں میں بچوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ کہیں بھی لوگ بچوں پر دھیان نہیں دیتے، بچے آسان ہدف ہوتے ہیں عورتوں کی طرح مگر میں۔۔۔ میں کیا کرتی، میں لکھ سکتی تھی سو میں نے لکھا اور بار بار یہی لکھا کہ آؤ بچوں کو بچاؤ مگر کسی نے لبیک نہیں کہا اور جانتے ہو جب قیامت آئے گی تو اس کی پہلی پکی نشانی کیا ہوگی؟ بچے پیدا نہیں ہوں گے۔ بچے نہیں ہوں گے زندگی نہیں ہوگی مگر سب لوگ میرا ٹھٹھہ اڑاتے تھے کہ یہ بی بی دیوانی ہے، دیوانے کی بڑ کون سنے، جو سنتا، یہی کہتا کہ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ اور دیکھو کیا ہوا؟ میرا کہا سچ ثابت ہوا کہ جو بستیاں بچوں کے رہنے لائق نہیں رہتیں، ان پر قیامت اتر آتی ہے کیونکہ وہ لوگ، جو بچوں پر شفقت کی صلاحیت کھو دیتے ہیں وہ دراصل اتنے مکروہ ہو چکے ہوتے ہیں کہ ہر بستی ان کی نحوست سے برباد ہو جاتی ہے۔

اور وہ مجھے بستی کی بربادی مرحلہ وار بتاتی رہی مگر مجھے کچھ یاد نہیں رہا کہ وہ کیا کیا کہتی رہی، مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ تھی کون؟ اور یہ بھی جان نہ پایا کہ میں کسی ایسی بستی میں کیونکر پہنچ گیا جیسی خانہ جنگی سے تباہ ہوئی بستیاں ہوتی ہیں۔ میں نے ذہن میں جوڑ توڑ کی کافی سے زیادہ کوشش کی مگر ناکام رہا۔ یوں بھی بربادی کی سلسلہ وار کہانی مجھے ٹھیک یاد نہیں رہی

تھی سو میں کڑیاں کیسے ملا پاتا اگر چہ میں کئی روز جٹا رہا اور ایک وقت آیا کہ میرا ذہن ماؤف ہو گیا اور وہ وقت بھی آیا کہ میں مست الست ہو گیا بلکہ تکنیکی زبان میں کہوں تو کچھ کچھ روبوٹ سا ہو گیا۔ روبوٹ کو منجمد ہوتے خون سے کھیلتے چار بچوں اور آدھی رات کو چیختے بڑے سر والے پانچویں بچے سے کیا مطلب! مگر ٹھیریے کہ مکمل مشین نہ بن سکا اور اس میں میرا کوئی قصور نہیں کیونکہ مجھے مکمل مشین بننے سے صرف ایک انسان روکتا رہا جو میرا غصیلا تھو بڑا دیکھ کر کہتا، ''بابا چھوری، بابا چھوری''، بس یہی ایک پہاڑ ہے جو سر نہ ہو سکا اور مَیں لڑھکتے لڑھکتے وہیں پہنچ جاتا جہاں سے چڑھائی۔۔۔ وہ بھی ہر وقت چڑھائی کرتی رہتی تھی۔

برسوں بعد سرِ راہ دیکھی تو مَیں نے گزر جانا چاہا کہ آخری بار اُس نے بہت ذلیل کر کے نکالا تھا اور خود بھی نکل گئی تھی، اور میں نکل بھی جاتا مگر اُس کی آواز۔۔۔ اُس کی آواز اتنی ہی دور سے آتی سنائی دی جتنی دور وہ خود جا چکی تھی۔ جب وہ بہت دُور جا چکی تھی تب بھی ہمارے درمیان رابطہ تھا، ٹیلی فونک رابطہ، برقی پیغامات کا رابطہ اور آخر میں فیس بک نامی فرسٹریشن، انفارمیشن، ڈس انفارمیشن پھیلانے والی خوبصورت ایجاد کے ذریعے رابطہ جو دوریاں گھٹاتی ہے اور دوریاں بڑھاتی ہے مگر یہ رابطہ بھی کیا رابطہ تھا کہ اُس نے تین بار منقطع کیا۔ جی ہاں۔ تین بار قطع تعلقی۔ اور میں ہار گیا اور میں نے خود کو صاف صاف کہہ دیا کہ ہاں میں اُس ساحرہ کو بھول چکا ہوں جس کے پاس آئن سٹائن کا دماغ ہے، جس نے کہا تھا کہ مَیں اس عورت کا خواہاں ہوں جو دماغ آئن سٹائن کا رکھے مگر عادات تابع فرمان روایتی بیوی کی طرح ہوں، ہاں میں اُسے بھول چکا ہوں گو میں کبھی کچھ نہیں بھول پاتا اور نزار قبانی نے کہا تھا کہ دل کی بیماریوں میں سب سے خطرناک بیماری اچھی یادداشت ہے سو مجھے وہ یاد رہی جسے میں نے بھلا دیا مگر اُس نے آواز دی تو لبیک نہ کہنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

بانو آبائی شہر اپنی اماں سے ملنے آئی تھی اور اُسے صدیوں بعد پہلی نظر دیکھتے ہی مجھے وہ خواب چہرہ یاد آیا جس کے حسن پر بربادی بھی پردہ نہیں ڈال سکی تھی اور میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اُس نے ہمیشہ مجھ منتشر الخیال کے انتشار کو سوا کیا سو اب کیوں نہ کرتی؟ وہ پری پیکر

باتیں ہی ایسی دنیا کی بتاتی کہ کبھی مجھے تحیر آن لیتا، کبھی حسد، کبھی رشک اور کبھی تعصب۔۔۔ وہ پرانے ہم وطنوں کو کوسنے بھی ایسے ایسے دیتی کہ میری پریشانی اور بڑھ جاتی کہ یہ جگہ میرے بچوں کے رہنے لائق نہیں۔ اُسی نے بتایا کہ جس دنیا کی وہ باسی بن چکی ہے وہاں ہر بچے کو اُس کے حقوق سے آگاہ کیا جاتا ہے، فرائض بھی بتائے جاتے ہیں اور بچاؤ کے راستے بھی دکھائے جاتے ہیں۔ جب میں نے کہا کہ بچوں کا استحصال وہاں بھی ہوتا ہے، فلاں رپورٹ دیکھو، فلاں خبر پڑھو، تو اُس نے جو جواب دیا، خوب دیا۔

''بے شک استحصال ہوتا ہے مگر استحصالیے کی پکڑ بھی ہوتی ہے۔''

اور مَیں نے سوچا کہ جہاں میں رہتا ہوں وہاں تو مقولہ ہی یہ مقبول ہے کہ جِتنا لُچا اُتنا اُچا۔۔۔ جہاں مقولہ ہی ایسا مقبول ہو وہاں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کس کی کیا پکڑ ہوتی ہوگی۔ اس نکتے پر آکر میرا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا جب تقابلی جائزے میں صاف صاف دکھائی دیتا کہ اُس کی دنیا کا نظام جرم پر حرکت میں آتا ہے اور میری دنیا میں مقتول کی ماں سب سے بڑی عدالت میں یہ کہتی ہے کہ میری بیٹیاں جوان ہیں، میں مقدمہ نہیں لڑ سکتی، قاتل کو معاف کرتی ہوں۔

اُس کے مختصر سے دورے میں مَیں نے اور یقیناً اُس نے بھی پوری کوشش کی کہ ہم اپنی کوئی بات نہ کریں سو ہم چند منٹوں کے لیے ملتے، چائے ختم ہوتے ہی ملاقات ختم ہو جاتی اور ہم نظریں چراتے ملاتے یوں اپنی اپنی راہ لیتے جوں وہ بات رہ گئی ہو جس کے لیے آئے تھے، مگر اگلی بار بھی یہی ہوتا، یوں ملاقاتیں کم اور اِدھر اُدھر کی بحثیں زیادہ ہوتیں بالخصوص برین ڈرین اور ملکی زبوں حالی۔۔۔ اور ملک سے باہر بیٹھے لوگوں کے سوشل میڈیا پر حب الوطنی کے بھاشنوں اور تمسخر اڑاتے جملوں، تضحیک میں ڈوبے فقروں، جن کے پیچھے شاید یہ بات چھپی ہوتی کہ دیکھو ہم پہلی دنیا کے باسی بن گئے اور تم تیسری دنیا کے جانور، دنیا کی ہر برائی اس ملک میں ڈھونڈ نکالنے اور جہاں وہ خود رہتے ہیں، وہاں کے متعلق کبھی ایک بری خبر بھی نہ سنانے۔۔۔ اور یاد نہیں کس کس بات پر میری اس کی بحثیں ہوتیں جنہیں لڑائی میں

بدلتے ذرا دیر نہ ہوتی اور وہ مدتوں پرانی عادت سے مجبور ہو کر جھٹ سے مجھے متعصب اور تنگ نظر ٹھیرا دیتی حالانکہ مَیں اُس کے نئے دیس کی اچھی باتوں کا کھلے دل سے اعتراف بھی کرتا مگر یہ یاددہانی بھی کراتا کہ مفادات کی وابستگی بڑی حقیقت ہوتی ہے۔انسان ہر جگہ ایک سا کمینہ ہوتا ہے مگر سماجی اور سیاسی ڈھانچے اُس کی کمینگی کی سطح کم سے کم رکھتے ہیں۔ اُس نے میری اِس بات سے کبھی اتفاق نہیں کیا کہ خاص آدمی ہی عام آدمی کو برا بناتے ہیں اور وہ انسانیت انسانیت کی ڈفلی بجا کر انفرادی اچھائی پر زور دیتی رہی لیکن اُس سے مل کر میرا یہ احساس اور بڑھ گیا کہ دنیا کے کچھ حصے اکیسویں صدی میں پہنچ چکے ہیں مگر میں جہاں رہتا ہوں، وہاں اٹھارہویں صدی ٹھیر گئی ہے بھلے میں جتنا کہوں کہ سب اچھا ہے۔

''بچوں کے حقوق کے ضامن قوانین یہاں بھی موجود ہیں۔۔۔''

''بالکل ہوں گے۔مگر کاغذات میں حقوق اقلیتوں کو بھی تمام کے تمام میسر ہیں، کیا تمھیں عملی طور پر بھی کچھ نظر آیا؟'' اُس نے میری بات کاٹ کر پوچھا تو مجھے چُپ سی لگ گئی۔ خاموشی برداشت سے باہر ہوئی تو اُس نے وہ بات کہی جو میں کبھی بھول نہیں پایا یوں بھی میں کبھی کچھ نہیں بھول پاتا۔

''اگر کسی معاشرے کی صحت مندی جانچنا ہو تو سب پہلے دیکھو بچے کس حال میں ہیں؟ جانوروں سے کیسا سلوک ہوتا ہے؟ اور میں تمھیں وہ بتاتی ہوں جو میں نے یہاں دیکھا۔''

''کیا دیکھا؟''

''میں لاہور آئی ہوئی تھی۔۔۔''

''کب؟''

''تین سال پہلے۔تم سے نہیں ملی تھی۔خیر چھوڑو، اب اس پر لڑائی نہ لڑنا۔میری بات سنو، ایک دن میرے چھوٹے بیٹے کو بخار ہوا اور میں اُسے لے کر مغلپورہ میں قریبی کلینک پر چلی گئی۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا لڑکا بھاگا بھاگا آیا۔اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ پٹی پٹی چلاتا رہا اور اس سے پہلے کہ کوئی پٹی کرتا یا نہ کرتا، قصائی ٹائپ دو آدمی

کلینک میں گھسے اور لڑکے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ کلینک مریضوں سے بھرا ہوا تھا، کسی نے نہیں پوچھا کہ زخمی لڑکے کو کیوں مار رہے ہو؟ کسی ایک آدمی نے بھی نہیں۔۔۔ یہ حال ہے۔''

''تُم نے پوچھا؟''

''مَیں تو ماں ہوں۔ میں نے پوچھنا ہی تھا اور تُم تو جانتے ہو مَیں لڑاکو ہوں۔۔۔''

''پانی پت کی ساری لڑائیاں تم نے صرف میرے ساتھ لڑی ہیں۔۔۔''

''دیکھو تم پرانی باتیں شروع نہ کرو، میری سنو، تُم تو جانتے ہو میں لڑاکو ہوں، اوپر سے امریکی شہری بھی، سو دونوں مردود پولیس کے حوالے کر کے چھوڑے۔ سوچو میں نہ ہوتی اور کوئی اور بھی نہ روکتا، ٹوکتا تو وہ قصائی کے بچے اس لڑکے کا کیا حال کر دیتے؟''

میں نے اسے تحسین بھری نگاہوں سے دیکھا اور وہ تھوڑا آگے جھکی اور اُس نے میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے، ٹھوڑی اور رخساروں کو ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر مسکراتے ہوئے کہا، ''تُم اب تک ہاٹ ہیڈڈ ہو۔ تُم دوسروں میں خامیاں ڈھونڈنے کے بجائے اپنی خامیوں کو تسلیم کرو اور اپنے طور پر کچھ نہ کچھ اچھا کرتے رہو۔ سوچو بھی کچھ نہ کچھ اچھا کریں تو کتنا کچھ اچھا ہو جائے۔''

''ہوں۔۔۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ، جب مَیں نے تیسری بار فیس بک پر اَن فرینڈ کیا تو تُم نے دوبارہ رابطے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''کیا کوئی فرق پڑا؟''

''میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ مَیں سمجھ گیا۔ تمہیں آگے بڑھنا آتا ہے۔۔۔'' اُس نے میری بات کاٹ دی، ''میں تمہاری اس بات کا جواب بھی نہیں دوں گی۔'' اور خاموشی نے جگہ بنالی۔

اُس روز چائے ختم ہونے کے بعد بھی وہ خاموش بیٹھی رہی، کافی دیر، بالکل خاموش، اِدھر اُدھر تاکا کیا۔

اگلی ملاقات میں پھر وہی گرما گرم بحث ہو رہی تھی کہ اس ملک میں یہ نہیں، اس ملک میں وہ ہے، نہیں وہ تو نہیں، کیا نہیں، معلوم نہیں، کچھ تو ہے جو نہیں، اور جب ہم تھوڑا تھک گئے تو اُس نے اپنی جہاں گردی کا نچوڑ چائے کے خالی کپ میں انڈیل دیا جو میرے سامنے پڑا تھا، میں تمہیں بتاؤں تم ایویں کہتے رہتے ہو کہ پڑھے لکھے لوگ اس سماج میں رہیں تو شعور کی سطح بڑھے۔ میں کہتی ہوں ہر آدمی اپنے تئیں انسان بننے کی کوشش کرے تو کچھ بنے مگر یہاں لوگ پتا نہیں کیا کیا بننا چاہتے ہیں، بس انسان بننا کسی کی ترجیحات میں نہیں۔ کسی کی بھی نہیں۔ اپنے آپ کو دیکھ لو، میں نے جب بھی تمہیں ٹٹولا، تمہاری ترجیح افسانہ نگار بننا ہے اور اسی شوق میں تم ساری دنیا کو پڑھتے پھرتے ہو مگر خود کو پڑھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لوگوں کی یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھتے رہتے ہو، اتنے علم کا کیا فائدہ اگر تم اسے عملی طور پر استعمال نہیں کر سکتے، اگر تُم نے خود کو پڑھنے کی کوشش کی ہوتی تو مجھے بھی پڑھ پاتے۔۔۔ مگر۔۔۔"

مَیں نے کوشش کی کہ وہ جملہ مکمل کرے مگر وہ چُپ رہی اور اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں دیکھتی رہی اور میں اُسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا کہوں؟ کئی باتیں ذہن میں آئیں مگر کشمکش نے کہنے نہ دیں البتہ ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھی کہ ہمارے سروں پر سوار لوگ ہمیں انسان ہی تو بننے نہیں دیتے مگر یہ سن کر بھی وہ کچھ نہ بولی اور جب کچھ دیر بعد بولی تو یہ بولی کہ اچھا، سناؤ، کوئی نئی کہانی سناؤ۔

کہانی کیا سناتا، خیال بتا دیا کہ دو حریف ملکوں کے درمیان کرکٹ کا کھیل جنگ کی طرح کھیلا جا رہا تھا۔ کھلاڑی دن بھر لڑتے رہے اور جب فتح کے قریب پہنچے تو قریبی بستی کے چند بچے گیند بلا تھامے میدان میں گھس آئے۔ حیرانی پھیل گئی کہ یہ کیسے ممکن ہوا؟ جیسے بھی ہوا، بچوں کو دیکھتے ہی میچ روک دیا گیا، بچوں نے اپنا کھیل کھیلا، کسی نے روکا نہ ٹوکا، جب وہ چلے گئے تب مقابلے کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے رُکا تھا۔

اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ چاند سا چہرہ میری اور بڑھا کر مسکراتے ہوئے

بولی۔ ''ارے واہ۔ یہ کہانی خواب دکھاتی ہے اور خواب کا خیال رکھا جائے تو تعبیر بھی مل جائے۔''

مَیں کچھ نہ بولا تو وہ میرے چہرے پر چند لمحے کچھ پڑھنے کی کوشش کرتی رہی، پھر تھکی تھکی سی بولی۔

''مَیں ایک بات برسوں سے کہنا چاہتی ہوں مگر۔۔۔مگر۔۔۔خیر خوش رہا کرو، دیکھو تم اپنی عمر سے کتنے بڑے نظر آ رہے ہو۔۔۔'' وہ پرس سنبھالتے ہوئے کھڑی ہو گئی تو مَیں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''مگر کیا؟ یہ اگر مگر اب تو ختم کر دو۔ پھر پتا نہیں کب ملو۔ ملو کہ نہ ملو۔۔۔''

وہ چپ چاپ بیٹھ گئی اور سنہرے رنگ میں رنگے ناخنوں سے میز کھرچنے لگی، میں بھی کچھ نہ بولا، ہم کہی کے زخم بھی کرید چکے اور اَن کہی کا ناسور بھی کھنگال چکے مگر خاموشی ہمیشہ راس آئی کہ خاموشی کلام کرتی ہے اور جب کلام کرتی خاموشی چیخنے لگی تو ہم اُٹھے اور الوداع کہے بغیر اپنی اپنی راہ ہو لیے۔

وُہ ایک بُرا دن تھا، بہت بُرا دن اور مَیں بوجھل دل کے ساتھ گھر آ کر سو گیا اپنے بیٹے کے ساتھ پلنگ پر، اس کا ہاتھ تھام کر، اس کے لمس سے مجھے توانائی ملتی ہے، سکون ملتا ہے مگر اُس بُرے دن کیا ہوا کہ میں نے آنسو دیکھے، ایک لڑکے کی آنکھوں میں آنسو، وہ لڑکا جو مینار پاکستان گیا تھا، اگلی جماعت چڑھنے کی خوشی میں، اور میں نے اُسے وہیں جھیل کے کنارے آنسو بہاتے دیکھا۔ وہ جھیل کے کنارے ایک لوہے کے ڈبے پر بیٹھا اُس کشتی کو دیکھ رہا تھا جس میں اس کی ہم جماعت تھی جو اس کا ناکام تخیل بنی جس میں وہ زندگی بھر اپنی پسند کے رنگ بھرتا رہا، وُہ پانی کا لمس محسوس کر رہی تھی اور وہ اُسے مسکراتا دیکھ رہا تھا، اس بات سے بے خبر کہ جس لوہے کے ڈبے پر وہ بیٹھا ہے، وہ اصل میں کشتی رانی کے ٹھیکیداروں کا اوزار رکھنے والا صندوق ہے، وہ بے خبر تھا مگر ٹھیکیداروں نے دیکھا تو چلاتے چلاتے آئے اور ایک نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ سے تھپڑ جڑ دیا حالانکہ وہ ڈبے سے اُٹھ گیا تھا، فاصلے پر کھڑا

ہو گیا تھا مگر اُس ادھیڑ عمر آدمی نے خوشی منانے آئے لڑکے کا دل توڑ دیا اور اُس دن کے بعد وہ کسی ایسے تفریحی مقام پر کبھی نہیں گیا جس کا بندوبست سرکار کے ہاتھ میں ہے۔

وہ لاہور میں رہتا ہے اور شاہی قلعہ نہیں جاتا، بادشاہی مسجد نہیں جاتا، شالامار باغ نہیں جاتا، عجائب گھر نہیں جاتا، چڑیا گھر نہیں جاتا، وہ تھپڑ سے نہیں ڈرتا اور عجیب ہنسی ہنستا ہے اور گاتا ہے، ''مسجد ڈھا دے، مندر ڈھا دے، ڈھینڈا جو کج ڈھا دے، اک بندے دا دل نہ ڈھاویں، رب دلاں وچ رہندا'' اور بڑبڑاتا ہے، ''یہ سالے مسجد بناتے ہیں، مندر بناتے ہیں، ڈھاتے ہیں تو دل ڈھاتے ہیں۔'' کبھی گھر میں جی گھبرائے تو نہر کنارے جاتا ہے اور گنگناتا ہے۔ ''او بستی آباد تھیوے، جتھاں یار میڈے دی جھوک اے۔۔۔''

اُسے دیکھ کر مَیں ڈرتا ہوں کہ کسی دن میرے بچے کے ساتھ کچھ ایسا نہ ہو جائے اور وہ باغوں اور بہاروں سے روٹھ جائے سو میں اُسے قریبی پارک لے جاتا ہوں اور تتلیوں کے پیچھے بھاگتا، پھول پتے سونگھتا دیکھتا ہوں۔ مَیں اُس کے ساتھ کھیلتا ہوں اور وہ میرے ساتھ کھیلتا ہے اور جب میں دفتر سے واپس گھر آتا ہوں تو وہ مجھے لینے دروازے سے باہر آتا ہے اور میں سنتا ہوں، 'اوئے بابا آئے، بابا آئے'، اور میں حارث کو بغلوں سے اٹھا لیتا ہوں، اپنے سے اوپر اٹھاتا ہوں، اٹھائے رکھتا ہوں، میرے بازوُ کھنے لگتے ہیں مگر اٹھائے رکھتا ہوں، اپنے سے اوپر، جہاں وہ کِھلکھلاتا ہے اور میں نیم تاریکی سے روشنی میں پہنچ جاتا ہوں جہاں میرے ناکام تخیل میں اِک شوخ رنگ اُبھرتا ہے اور مجھے قلقاریاں سنائی دیتی ہیں اور قلقاری سے اچھا کچھ بھی نہیں اور مَیں اسی کے سحر میں سوتا ہوں جو گزشتہ شب کچھ ٹوٹ سا گیا۔

وہ لڑکا، جسے سب کدو کے سر والا کہتے ہیں، پھر چلا رہا تھا، معلوم نہیں کتنی دیر سے، یقیناً کافی دیر سے، مَیں نے اُس کی چیخ و پکار سنی اور نظر پھیر لی مگر نظر پھیرتے ہی منجمد ہوتے خون سے کھیلتے چار بچے سامنے آ گئے اور اُن سے کچھ پرے ایک اور ننھا منا بچہ کھڑا تھا، جبھی میری آنکھ کھل گئی اور مَیں نے شور ختم ہونے کا انتظار نہیں کیا۔

بیس ستمبر دو ہزار اٹھارہ عیسوی

عالمِ تمثال

وہ، جس کے کئی نام ہیں، ایک رات پلنگ پر چت لیٹا زیرو واٹ کے بلب کی پیلی مدھم روشنی میں چھت کو سوچیلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے کئی تصویریں دکھائی دے رہی تھیں جو اُس نے کبھی بنائی تھیں اور چند ایسی بھی نگاہوں میں پھر رہی تھیں جو اُس نے نہیں بنائی تھیں۔

یہ کیفیت پہلے بھی طاری ہو چکی تھی اور وہ نجات کے لیے خود کو کسی کام میں الجھا لیتا تھا یا لمبی تان کر سو جاتا تھا۔ تصویریں جب اُس کے حواس پر حملہ کرتی تھیں تب بے مائیگی کا احساس بڑھ جاتا تھا اور ناقدری کچوکے لگاتی تھی مگر اُسے یہ خیال بھی آتا تھا کہ ابھی برش کی وہ صفائی نہیں دکھا پایا جس کے بعد تسلی سے ہاتھ دھولے۔

اُس کی چھت سے نظر ہٹی تو سامنے دیوار پر جا ٹکی اور جانے اُسے کیا سوجھی کہ غبار کا غلبہ دبانے کے لیے ماتھے پر ہتھیلی زور زور سے رگڑ کر کسی فاتح کی طرح پلنگ کو تخت جان کر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے چھوٹے سے کمرے کی ہر دیوار کو غور سے دیکھا۔۔۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ سر پر دونوں ہاتھ لے جا کر انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر سوچتا رہا۔۔۔ دیر تک سوچتا رہا۔

اگلے دن وہ بازار گیا اور رنگوں کے کئی ڈبے اور بُرش اٹھا لایا۔ اُس نے ایک ڈبے کا ڈھکن اُتارا اور مخصوص بالٹی میں آدھا انڈیل دیا۔ پھر تیل ملایا اور ایک بڑے سے برش کو اچھی طرح ڈبو کر شمالی دیوار پر پھیرنے لگا۔ دائیں سے بائیں، اوپر سے نیچے، قلعی کرنے

والے کی طرح مگراس سے کہیں بہتر ہاتھ چلایا کہ صفائی دیکھ کر کسی کا بھی جی عش عش کر اُٹھے اور اُس پر بھی مسرت کے چھینٹے لحظہ بھر پڑے مگر اُسے اچھی طرح محسوس ہونے سے پہلے خشک ہو گئے۔

تین دن وہ اُس دیوار کو دیکھتا رہا جس پر پینٹ چمک رہا تھا۔ کہیں بدنما نشان یا ٹیڑھی میڑھی لکیر نظر نہ آتی تھی۔ وہ قمقمہ جلاتا تو روشنی چوگنا معلوم دیتی تھی لیکن اسے چین نہ پڑا۔ ایک رنگ میں رنگی دیوار، جو پہلے بھلی لگتی تھی، اُسے اُکتانے لگی۔ اُس نے بے حد سوچ بچار کے بعد پہلے سے مختلف رنگ کا ڈبا کھولا، تیار کیا اور رات بھر جاگتا رہا۔ سحری کے وقت جب چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور مرغ بانگیں دے دے کر دانے دُنکے کے لیے خود ساختہ مالکان کو اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ بھاری پپوٹوں کے ساتھ دھندلی نگاہوں سے دیوار دیکھ رہا تھا جو اُسے آگے پیچھے جھولتی نظر آ رہی تھی۔

اُس کا دل پھر ٹوٹ گیا اور خوبصورت دکھائی دینے والی دیوار کو دو دن بعد دیکھنا تک محال ہو گیا۔ اُس نے پوچھا کہ سب سے اچھا رنگ چڑھایا، پھر کیوں نہیں بھایا؟ اور خود کو تسلی دی کہ ممکن ہے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو۔ دونوں دفعہ سوچ سمجھ کر، محسوس کر کے، رنگوں کا انتخاب کیا لیکن گمان ہے کہ جمالیاتی حس کو متاثر نہیں کر پائے۔ یہ جان لینا آسان نہیں کہ آدمی کیا چاہتا ہے اور کیا اُسے واقعی چاہئے۔ اُس نے اپنی بہترین تصویروں کو دیکھا، ان میں موجود نمایاں رنگوں پر غور کیا اور ایک رنگ میں ڈوب گیا۔ کئی دن اُس کے ساتھ تخیل کے لچکیلے برش سے اندر باہر خط کھینچتا رہا۔ غیر مرئی پنجرہ بنا کر خود کو اُس میں قید کر لیا اور ایک دن اپنے آپ کو آزاد کر کے بازار سے نیا ڈبا خرید لایا۔ اُس نے رنگ تیار کیا اور دوپہر سے شام تک پسینہ پسینہ ہوتا رہا۔

افسوس کہ اس بار بھی وہی ہوا اور اُسے سمجھ نہیں آئی کہ غلطی کہاں ہوئی ہے؟ سوال اُٹھا کہ ہاتھ میں لرزش ہے، برش کے تاروں کے کنارے ٹیڑھے ہیں یا رنگ کے انتخاب میں

خطا کی؟ اُس نے اپنی کن پٹیوں پر انگوٹھوں سے دباؤ ڈالتے ہوئے جواب دیا کہ تینوں باتیں ایک وقت میں ایک ساتھ غلط نہیں ہوسکتیں لیکن سوال بدستور جواب طلب رہا کہ کیوں تیسری دفعہ بھی تین دن بعد پلنگ پر بیٹھ کر دیوار کو دیکھنا مشکل ہوگیا ہے؟ کہیں میرے دماغ میں کچھ اپنی جگہ سے ہل تو نہیں گیا جو میں صحیح فیصلہ نہیں کر پا رہا؟ سوچ کی برق کوندی کہ ایک شے ایک دور میں اچھی ہوتی ہے مگر دوسرے زمانے میں بُری قرار پاتی ہے اور میں وقت کی ضرورت نہیں جان سکا جبھی بظاہر بے چینی حصے میں آئی۔ وہ اور بھی کئی سوال خود سے پوچھتا رہا اور جواب دیتا رہا لیکن تسلی بخش جواز ایک نہ ڈھونڈ سکا۔

چوتھی دفعہ اُسے گھر سے نکلنے میں کافی وقت لگا اور وہ اپنے تئیں بہت غور و فکر کے بعد بازار گیا۔ پہلے سے زیادہ بڑی دُکان سے انتہائی قیمتی رنگ خرید لایا جس کی قیمت چکانا اس کے لیے مشکل بھی تھا۔ اس بار تبدیلی یہ آئی کہ اُس نے دیوانوں کی طرح جٹ جانے کے بجائے ٹھنڈے پانی سے نہا دھو کر دیوار کا اچھی طرح جائزہ لیا جس پر مختلف رنگوں کے پے در پے استعمال سے ایک نیا رنگ نمودار ہو چکا تھا جو بے رنگ تھا لیکن وہ نئے منظر میں کچھ نیا ڈھونڈ نہ سکا اور پوری دلجمعی سے پُرانا عمل دہرانے لگا۔ جب کام ختم کر چکا تو کنکھیوں سے بڑے کینوس کو دیکھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ نیا منظر جو پرانا ہو چکا تھا، ایک اور الجھاوے کے ساتھ اُس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اُس نے دماغ میں جاری جوڑ توڑ روکنے کی بہتیری کوشش کی لیکن آخر ہار کر اُس نے برش دیوار پر دے مارا اور پلنگ پر منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ کب نیند آئی، اُسے پتا بھی نہ چلا۔

صبح اٹھا تو دیوار پر پوچا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُس نے زمین پر زخمی پڑا برش پکڑا اور اس کے کھردرے، مڑے تڑے، گھسے ہوئے بال کچھ دیر تکتا رہا۔ پھر اسی شکستہ برش کو مختلف رنگوں کے ڈبوں میں ڈبو ڈبو کر دیوار پر آڑھا ترچھا پھیرنے لگا، کبھی چھینٹے اُڑاتا اور کبھی زور زور سے ضربیں لگاتا۔ اُس نے کئی دن یہ عمل وقفے وقفے سے جاری رکھا اور جب

اُسے محسوس ہوا کہ دیوار پر غبار مزید نہیں نکال سکتا تو گھر سے آوارہ گردی کے لیے نکل پڑا۔
بستی بستی خاک چھان کر لوٹا تو دیوار دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں کہ اُس کے لیے پرانے منظر میں نیا چہرہ نمودار ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک انجانی مسرت کے ساتھ پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں کہ اَن دیکھے جہاں میں پہنچ جائے لیکن خیال کی وادی میں دیکھے مناظر اُمڈ آئے اور اُسے صحراؤں کے بیچوں بیچ نخلستان، سمندروں میں سانس لیتی مخلوقات، پہاڑوں کے غار اور آبی ڈھلوانیں، سبزے سے ڈھکی چٹانیں، ہری اور پیلی کھیتیاں، نگر نگر میں بھانت بھانت کی بولیاں، کچے پکے مکان، کنکریٹ کے منتظر اونچے نیچے راستے، فضا میں اُڑتے جہاز، نظر کی پکڑ میں نہ آنے والی ریل کی پٹڑیاں اور ٹیڑھی میڑھی سڑکیں، اِن پر دوڑتی، رعب جماتی، چمچماتی گاڑیاں، مال بردار ٹرک اور ٹرالے اور زندگی کا بوجھ ڈھوتے چھکڑے یاد آئے۔ اُس نے لاشعور کی رو میں سر اٹھا کر نیلا آسمان دیکھا جسے وہ آوارہ گردی کے دوران میں رات بھر تکتا تھا کہ اس پر چاند اور ستارے چمکتے تھے۔ کبھی کالی گھٹائیں چھا جاتی تھیں اور کبھی صاف شفاف پسِ منظر میں طرح طرح کے پرندوں کی اڑان دلکش پیش منظر بن جاتی تھی۔ نیلی چھتری کے سائے میں مختلف اشکال بناتے، ہلکورے کھاتے، پانی کے غبارے لبھاتے تھے لیکن یک رنگ آسمان پر سورج پوری آب و تاب سے اپنا بیش بہا تحفہ بانٹتے ہوئے دیکھا نہیں جاتا تھا اور اُسے یاد آیا کہ جب ہر طرف سیاہ چادر تن جاتی تھی تو اُس کا جی گھبراتا تھا۔

وہ ایک نئے عزم کے ساتھ بازار میں دُکان دُکان پھر رہا تھا اور رنگ اکٹھے کر رہا تھا۔
اُس نے چھوٹے بڑے برش بھی خریدے اور واپس آ کر پوری دیوار پر سفیدی پھیرنے کا آغاز کیا۔ اُسے کئی لیپ کرنے پڑے تب جا کر پچھلے نشان چھپے، دیوار گوری گوری نظر آنے لگی اور وہ جوش سے بھر گیا۔ اُس نے برش ہاتھ میں پکڑے رنگوں کے ڈبوں کو دیر تک دیکھا جیسے چناؤ کر رہا ہو۔ پھر ایک ڈبے میں ڈبو کر دیوار کے ٹھیک درمیان میں دائرہ بنا دیا جس کی

گولائی سنوارنے میں بنانے سے بھی زیادہ محنت کی۔ دائرے کے ساتھ دوسرے رنگ سے ایک چوکور خانہ بنایا جس کے چاروں ضلعے مقدار میں برابر اور زاویے قائمہ رکھے اور اس مربع کے گرد چار متوازی خطوط کھینچ دیے۔ یہ عمل ختم ہوا تو وہ دائرے اور خانے کو سر پر دایاں ہاتھ رکھے بغور دیکھتا رہا۔ تسلی ہونے پر اُس نے کسی اور رنگ سے چوکور کے کناروں کے ساتھ کنارے جوڑ کر برابر حجم کا مربع بنایا، خطوط بھی کھینچے اور اسی طرح رنگ بدل بدل کر ایک دوسرے کے ساتھ مِلا مِلا کر ایک سی لمبائی، چوڑائی کے خانے بناتا رہا، روغنی خطوط کھینچتا رہا، ٹھیر ٹھیر کر دیکھتا رہا۔ جب وہ چھت کے قریب پہنچا تو اُس نے قدرے بڑے خانے نچلوں سے یوں جوڑ کے بنائے کہ بڑوں کی چھوٹوں کے بغیر موجودگی بے معنی معلوم دیتی تھی اور چھوٹوں کا بڑوں کے بغیر حسن ماند پڑتا تھا۔ اس کے بعد وہ دیوار کے نچلے نصف پر خانے بناتا رہا اور جب فرش کے قریب پہنچا تو مربع جات ایک دوسرے سے یوں جوڑے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود برا معلوم دے۔ پھر اس نے ژرف نگاہی سے دیوار دیکھی، اطمینان سے پلنگ پر لیٹا اور چند لمحوں بعد کمرے میں خراٹے بے سراالاپ دے رہے تھے۔

اُسے حیرانی ہوئی کہ اس مرتبہ اُسے تیسرے ہی دن اکتاہٹ کا دورہ کیوں نہیں پڑا؟ لیکن وہ ہر رات سونے سے پہلے ایک دائرے اور چھوٹے بڑے رنگ برنگے خانوں سے سجی دیوار کو دیکھتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ یہ فرحت بخش احساس مہینوں اُس کے ساتھ رہا لیکن ایک دن دوبارہ اُس کی انگلیوں میں بے چینی ہونے لگی تو اُس نے برش پکڑا اور دیوار کے سامنے کھڑا سوچتا رہا۔۔۔ دیر تک سوچتا رہا۔ تھک گیا تو پلنگ پر آبیٹھا لیکن زیادہ دیر ٹِک نہ سکا کہ اُس کی بڑی سی کھوپڑی کی چھوٹی سی کھڑکی پر خیال نے دستک دی اور اُس نے ایک چھوٹا برش لے کر خانوں میں خوب صورت بیل بوٹے اس اہتمام کے ساتھ بنانے شروع کیے کہ تمام کی خوش نمائی ایک سی ہو۔ اس عمل میں اُس کے کئی دن صَرف ہوئے تب جا کر جاذبِ نظر نقاشی مکمل ہوئی لیکن جب اس نے پوری دیوار کو تنقیدی نظر سے دیکھا تو اُسے کچھ کمی

محسوس ہوئی اور اُس نے چند خانوں میں گُلکاری بڑھا دی ۔ اب صرف دائرہ یک رنگ تھا ،اس میں کوئی بیل تھی نہ بوٹا تھا اور یہی بات اسے پریشان کر رہی تھی کہ کیا کرے؟ کبھی خیال آتا کہ اسے یونہی خالی رہنے دے اور کبھی صدا پڑتی کہ اس میں ایک پیڑ بنائے جس کی شاخیں پھلوں سے جھکی ہوئی ہوں اور ڈالیوں پر طرح طرح کے مہکتے پھول بھی ہوں لیکن وہ جھجکتا رہا اور ڈرتا بھی رہا کہ کہیں کُل محنت چھوٹی سی غلطی سے رائیگاں نہ چلی جائے۔ کئی روز اسی مخمصے میں گزر گئے تو ایک رات اسے نیند میں کیا دکھائی دیا کہ یک رنگ دائرے میں کئی مدور رونما ہو چکے ہیں اور جب بیدار ہوا تو وہ حیران ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں مَلتے ہوئے دائیں بائیں، آگے پیچھے ہو کر مختلف زاویوں سے جائزہ لیا تو اطمینان اور خوشی کی لہر اندر باہر دوڑ گئی اور اُس نے برش اور رنگ سنبھال کر رکھ دیے۔ اُس نے خود کو یقین دلا دیا کہ اب اِن کی مزید ضرورت نہیں، فن پارہ تخلیق ہو چکا ہے جس میں تنظیم ایسی ہے کہ ہر خانہ دوسرے سے اس طرح جڑا ہے جیسے ایک بدن کے اعضا، رنگوں کا امتزاج کہ قوسِ قزح کا شائبہ ہوتا ہے اور توازن یوں ہے کہ ایک نکتہ اور ایک چھوٹی سی لکیر بھی سارا حسن غارت کر سکتی ہے۔

اُس دن کو بیتے اک مدت ہو چکی ہے، برش اور رنگ الماری میں پڑے ہیں مگر وہ ،جس کے کئی نام ہیں، انھیں کبھی کبھی اچھی طرح دیکھ لیتا ہے کہ کہیں خراب نہ ہو جائیں گو وہ خود کو تسلی دیتا رہتا ہے کہ ضرورت نہیں پڑے گی۔

پندرہ اپریل دو ہزار سولہ

ارتعاش

صبح اُٹھنا اور کاموں کی طویل فہرست جو اُس کی پیشانی پر ہوش سنبھالنے کے بعد نقش کر دی گئی، دیکھنا اور جُٹ جانا اِس قدر بھاری پڑا کہ چڑچڑا پن اُس کی ذات کا حصہ بن گیا جو کئی عارضوں کا نتیجہ ہے اور جس سے کئی بیماریاں وجود بھی پاتی ہیں۔ ایک اذیتِ مسلسل یہ ہے کہ جن کے لیے خود سے نظر چرائی، وقت کے ساتھ اُن کی نگاہوں میں وقعت کم کم سی معلوم دینے لگی اور اِس سے مکمل عذاب اِس نامکمل دنیا میں شاید کوئی اور ہو جس میں تکمیل بذاتِ خود عذاب سے کم نہیں۔

اُس کی زندگی بہتوں سے بہت بہتر رہی۔ ناآسودہ محبت، جو کبھی آسودہ تھی، کے سوا کچھ بُرا نہیں تھا۔ اچھی تعلیم، اچھا روزگار، بڑا گھر، گاڑی، خوش شکل بیوی، پیارے بچے اور۔۔۔ اور ایک دن وہ اپنے آپ کو خچر سمجھنے لگا۔ کسی انجانی کمی کا ہمہ وقت کھلنا سوہانِ روح بن گیا۔ وُہ اپنی کامیابیاں و کامرانیاں اپنے آپ کو گنوا گنوا کر دلاسے دیتا رہتا مگر بے چینی سی بے چینی تھی کہ کم ہو کے نہ دیتی اور بے قراری کو مہمیز تب پڑتی جب تمام تسلیوں کے بعد اُسے مزید خالی پن محسوس ہوتا۔ بے مائیگی اور زیاں کا احساس غالب آ ہی جاتا جس سے نجات کے لیے راہیں تلاشنا ہی تکمیل کی طرف لے جاتا ہے تو اُس نے بھی کتابوں سے رشتہ دوبارہ جوڑا کہ شاید کوئی ایسی ترکیب مل جائے جس سے وہ انسان بن جائے جبکہ کتابوں نے اُسے کبھی تنہا کیا تھا وہ قمقمہ روشن کر کے، جس کے بغیر ناقابلِ قبول اوامر کو قبول کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور زندگی زیادہ تلخ نہیں ہوتی۔

اُس نے جاپانی لوک دانش کے ایک خیال کو اپنے تئیں آزمانے کا فیصلہ کیا۔ وہ سیکڑوں سال پُرانے برگد کے سامنے آنکھیں بند کر کے، ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہونا چاہتا تھا اور پراتھنا کرنا چاہتا تھا کہ من بھیتر بھونچال کو دیوتا خود میں سما لے اور اُسے شانتی بخش دے۔ شومئ قسمت کہ وہ برگد کی تلاش میں گیا بھی تو اُس باغ میں گیا جہاں کبھی اِک مہ رو کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے جاتا تھا۔ وُہ سانس لینے کو ایک پتھریلے بنچ پر بیٹھا تو ٹاہلی کے ٹہنی جال کو سامنے دیکھ کر یکا یک یاد آیا کہ یہ تو وہی جگہ ہے جہاں وُہ بیٹھتی تھی جس کی چاہ میں بچوں کی طرح مچلتا تھا اور جسے پانے کے لیے خود کو کھو دیا اگرچہ بازیافت کی راہ پر گامزن بھی ہوا مگر اس وقت کہیں اور جا رہا تھا، نینوں کی وادیوں میں، جہاں کبھی بھٹکنے لگتا تھا تو وُہ ہاتھ تھام لیتی تھی لیکن عنایت پر طمانیت کے بجائے وہ ہل من مزید کا راگ الاپتا رہا تھا اور اِس شدت سے کہ ایک دن ساز کے تار ٹوٹ گئے جنھیں جوڑنے کی کوشش میں اُس کی انگلیاں فگار ہو گئی تھیں اور آج سوچ رہا تھا کہ جانے اُسے کیوں خوش مزاجی کا دعویٰ تھا، میں اُس کے چنچل پن سے محروم رہا تو کیسے مان لوں کہ وہ چلبلی البیلی تھی لیکن چشمِ نم میں رقصاں گُلِ نو بہار کو شرمانے والے بیضوی چہرے نے بے قراری میں قرار اور قرار میں بے قراری کی سی کیفیت پیدا کر دی اور سفر بھی طویل ہو گیا۔ ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ دار، یار سجن، اور بال بچے ۔۔۔ ایک کے بعد ایک عکس اُبھرتا اور ڈوبتا رہا۔

اُسے وہ دو بھائی بھی یاد آئے جن میں سے بڑا تو اُس کی مانند زندگی کرتا رہا اور چھوٹا بیوہ ماں کی جھریاں بڑھا کر، باپ سمان بھائی کے ماتھے پر مزید شکنیں سجا کر، دُور کہیں پہاڑوں میں سر ٹکراتے ٹکراتے سینہ چھلنی کرا کر، کچھ سے دہشت گرد کا الزام اور کچھ سے مجاہد کا اعزاز پا کر، اپنے پیچھے کئی سوال چھوڑ گیا جن کے جواب ڈھونڈنے تو دور کی بات کسی نے سوالیہ نشان دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ اُس کے لیے زندگی میں کوئی کشش نہ تھی یا اسے موت کے بعد دلکشی کی جھلکیاں پسند آ گئیں؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اُس کے پاس کرنے کو

اور کچھ نہ تھا یا اُسے کسی نے کچھ اور کرنے کا موقع نہیں دیا؟ اور گمان یہ بھی ہے کہ کچھ لوگ بدلے کی آگ میں جلنے کے واسطے ہی آتے ہیں لیکن اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ مسالہ کس نے رگڑا اور کس نے تیل چھڑکا؟ پرائی آگ میں جل مرنے کا شوق پروانوں کی جبلت میں گوندھ دیا جاتا ہے شاید اور جبر کا جہنم بھی تو بہت بڑا، بہت بڑا ہے۔

سوالات کا ریلا اور وہ ایک اکیلا۔۔۔ بنچ پر بیٹھا خود کلامی کرتا ہوا۔۔۔شاید کسی نے اُس دانا کے بول نہ سن رکھے تھے جس نے دُور دیس کے چھوٹے سے قصبے میں بیٹھ کر کہا تھا کہ آزاد سوچ کے خاتمے سے بغاوت ختم ہوتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں۔ یہ ممکن نہیں بشرطیکہ سو چیلے سوتے ہوں۔ ایک راستہ بند ہو سکتا ہے، تمام کبھی نہیں ہوتے تو بغاوت کیسے مٹ سکتی ہے۔ کہیں یہ انسان کے خمیر میں نہ ہو؟ وہ صحیح کہتی تھی کہ مجھے خود کو جاننے اور ماننے کی ضرورت ہے جیسے اُن دو بھائیوں نے دو متضاد جہات میں خود کو تسلیم کیا لیکن اُن کی ماں کا کیا قصور تھا؟

خاموش ساعتوں کے درمیان قطرے گرنے کی آواز مخل ہوتی رہی اور جب بے دھیانی سے اپنا چہرہ پونچھا تو کسی اور کے آنسو یاد آ گئے جنہیں دیکھ کر سرما کی دوپہر میں کھِلی کھِلی دھوپ بھی پانی پانی ہو گئی تھی۔

وہ ہزاروں سال سے آباد شہر کے نوآباد نگر کے گلستاں میں قدرت سے ہمکنار ہونے گیا تھا جہاں ایک گورا چٹا لڑکا ایک پودے کی شاخوں میں کچھ رکھ رہا تھا کہ مالی نے دیکھ لیا۔ اُس نے ایک گالی اُچھالی تو ساتھیوں نے پانچ سات۔۔۔اور اُس کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی پہنچے نہ تھے کہ ایک طرف سے پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک شخص بھاگا بھاگا آیا اور دس بارہ سال کے بچے پر بھونکتے پنجے مارنے لگا، مزاحمت ہوئی مگر ایک پالے ہوئے بُل ڈاگ کی مانند تگڑے جاندار اور بے گھر بچے کا کیا مقابلہ۔۔۔ مالیوں کے پہنچنے تک وہ خاصا بھنبھوڑ چکا تھا۔ سر، سر کہہ کر چھڑایا مگر گالیوں کا دور چلتا رہا اور سڑے سر کے گلے منہ سے

سڑانڈ نکلی۔

''بلا پُلس نوں۔۔۔''

اور چھوڑو جی، چھوڑو جی کی آوازوں کے درمیان بچہ نکلا، مڑ مڑ کر دیکھتا، چہرہ پونچھتا اور پیچھا کرتی گالیوں کا شعلہ بار نگاہوں سے سامنا کرتا جاتا۔ اُس کی آنکھیں۔۔۔ وہ آنکھیں جن میں شرارت کھیلنی چاہئے تھی، نفرت سے بھر چکی تھیں اور اُس نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا کہ یہی ایک دن بم پھوڑے گی۔ سب چلے گئے تو اُس نے آگے بڑھ کر شاخوں میں دیکھا اور کاغذ میں لپٹا روٹی کا ایک ٹکڑا پایا اور سوچا کیا یہی زندگی ہے جو اُس آفتاب رُو پر تھوپ دی گئی یا اُسے تبدیل کرنے کا موقع بھی کوئی دے گا؟ مگر اِس کے لیے تو توپ کے دہانوں کے بجائے تجوریاں کھولنی پڑیں گی اور تختی پونچھ کر نیا سبق لکھنا پڑے گا اور یہ کون کرے گا؟ اُس نے بنچ پر بیٹھے بیٹھے جھرجھری سی لی، بند آنکھیں کھول کر گردن اُٹھائی اور چند ثانیے بعد گریبان میں جھانکا۔ خود کو کوسا کہ کیوں نہ بولا؟ کیوں نہ روکا؟ پھر تسلی دی کہ بولتا بھی تو کیا؟ اکیلا کیا کر پاتا؟ پھر بھی کچھ کرنا چاہئے تھا۔ اطمینان ہوتا کہ ہاں میں نے کوشش کی تھی جیسے اُن چند لمحوں کو اکثر یاد کر کے خوش ہوتا ہوں جب ایک چوراہے پر ہری بتی کا انتظار کرتے گاڑی کے شیشے سے باہر دیکھا تھا کہ ایک موٹر سائیکل سوار ہٹا کٹا جوان سگریٹ کے کش پر کش لے رہا تھا اور یہ دیکھ کر کتنی تکلیف ہوئی تھی کہ اُس کے آگے ایک ننھا منا لڑکا ہینڈل پکڑے گیں گیں کر رہا تھا اور پیچھے بیٹھی عورت نے بھی دو بچے اٹھا رکھے تھے۔ چند ثانیے کشمکش میں گزار کر شیشہ نیچے کر کے کہا تھا۔

''کچھ خیال کرو۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بعد میں پی لینا۔ کہیں اکیلے بیٹھ کر۔''

اور اُس کرخت چہرے والے جوان نے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے سگریٹ سڑک پر پھینک کر بوٹ تلے مسل دیا تھا۔ یہ دیکھ کر کس قدر حرارت بھری مسرت محسوس ہوئی تھی مگر آج سب بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ وقت کے ساتھ واقعی بدلاؤ آتا ہے، منظر میں، نظر

میں، زاویۂ نظر میں۔۔۔اور بری چیزیں اچھی ہو جاتی ہیں اور اچھی بھی بری دکھائی دینے لگتی ہیں جیسے میرے لنگوٹیے کے ساتھ ہوا تھا۔

اُس نے بازآفرینی سے مملو ایک سرد آہ بھری۔

دیس میں لاکھوں روپے آمدن کے ساتھ خوشحال زندگی کے باوجود ترقی یافتہ دنیا کا حصہ کہلانے کے لیے بچے بچیاں دُور دیسوں کو نکل لیے اور بیوی بھی اُنھی میں سے ایک کے ساتھ ہو لی۔ پولیو مارے وجود کے ساتھ سماج میں باعزت مقام پانے کی مسافت کے دوران میں جو درشتی اُس میں در آئی تھی، بظاہر اور بڑھ گئی مگر بباطن دھری کی دھری رہ گئی اور زبان بات کرنے کو ترستی رہی حالانکہ ایک دور تھا کہ ملاقات کے لیے وقت لینا پڑتا تھا۔ پُرانے شہر کے ڈربہ نما گھر سے جدوجہد کی ابتدا اور نئے شہر کی بڑی سی کوٹھی کے چھوٹے سے کمرے میں تن تنہا انتہا دُکھی نہ کرے تو اور کیا کرے مگر کیسے اور کب تک؟ بس یار، یہی زندگی ہے۔ میرا اختتام بہتر ہو شاید۔۔۔ مرنا تو ہے ہی، اپنوں یا غیروں میں، کیا فرق پڑتا ہے؟ نہیں۔ پیارے پاس ہوں تو تسلی رہتی ہے، زندگی زیادہ بری نہیں گزاری۔

وہ بنچ سے اُٹھا اور ذہن خالی کرنے کی کوشش میں ٹہلنے لگا۔ نیلے پیلے، ہرے لال پھولوں اور سبز اوڑھنی اوڑھے پیڑوں نے اُس کی توجہ تھوڑی دیر کے لیے بھٹکانے میں کامیابی پائی مگر سوچ کا دھارا ایک اور سمت بہنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ اکثر پودے بدیسی ہیں اور کچھ پیڑ بھی اجنبی ہیں۔ یہ خوبصورت تو بہت ہیں مگر کاغذی کاغذی۔۔۔ خُوشبو ہے نہ پھل اور چھاؤں بھی نہیں مگر یہ تو وبا کی طرح پھیل چکے ہیں اور وبائیں تباہی مچاتی ہیں۔

میرا برگد پیچھے رہ گیا اور۔۔۔ اور۔۔۔

اور اُس نے موتیے کی کیاری کے قریب، قیمتی پینٹ کوٹ گندا ہونے کی پروا کیے بغیر، لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی زندگی طرح طرح کے روپ بھرنے لگی۔

بھوک سے بلکتے بچوں کی فروخت سے لے کر دوا کے لیے ایڑیاں رگڑتے بوڑھوں

تک، تین سے پنچ ستارہ ہوٹلوں کی شاموں اور راتوں سے گرمیوں کی چھٹیاں ٹھنڈے اور سردیاں گرم علاقوں کے سیر سپاٹوں، لیبارٹری میں موٹے شیشوں والے چشموں کے پیچھے چمکتی آنکھوں سے کتابوں اور کاغذوں سے بھرے کمرے کے ایک کونے میں قلم گھساتے گھساتے دیدوں کے گرد سیاہ حلقوں اور نادیدنی، لکڑی کی میز پر ٹانگیں پسارے بچوں کے رٹے سننے اور سونے سے دُور افتادہ گاؤں میں ایک پائی لیے بغیر پڑھانے اور تارکول بچھی سڑک کے کنارے نشے کی لت میں لتے، غربت سے لتھڑے بچوں کو الف۔ ب سکھانے، سورج طلوع ہونے کے ساتھ کچے پکے گھروں سے نکلنے اور غروب ہونے کے بعد واپس آنے کے درمیان اور چار دیواری کے اندر زندگی دیکھے کیا کیا تماشے ایک بتاشے کے لیے اور اندھیرے سے اجالے میں جو کھیل ہوتے ہیں، وہ بھی تو ایک بتاشے کے لیے ہی ہوتے ہیں اور یہ بتاشا کیا ہے؟

وہ واپس وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا مگر اُس نے سوچوں سے بوجھل ذہن کے ساتھ اردگرد نگاہ دوڑائی اور کینٹین نظر آنے پر چل دیا۔ ایک میز پر پڑے اخبار پر نظر ڈالی، چاکلیٹ کھاتے ہوئے طویل خشک سالی سے اموات کی خبر پڑھی، چپس کا پیکٹ ہاتھ میں پکڑا، جوس بھری بوتل خریدی اور دوبارہ اُسی بنچ پر آ کر بیٹھ گیا لیکن زیادہ دیر تک نہ سکا اور چل دیا۔

ڈرائیو کرتے بھی زندگی کے رنگ دیکھتا اور کچھ نہ سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک اشارے پر اُس نے اپنے سے بڑی عمر کے آدمی سے پلاسٹک کا فٹ بال لیا، پانچ سو کا نوٹ دیا اور بقایا لیے بغیر جلدی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گھر پہنچ کر وہ سب کو نظر انداز کرتے سیدھا پوتے کے کمرے میں گیا جو جھولنے میں اکیلا بیٹھا خود سے کھیل رہا تھا اور دادا کو دیکھتے ہی کِھل اُٹھا، ہُمک ہُمک کر بازو بڑھائے، ہاتھ ہلائے، ایں ایں، اوں آں، کا کا، آ آ کے اِشارے دیے اور آنکھیں مزید پھیلا کر، مٹھّیاں بند کر کے ہونٹ بھینچ کر زوں زوں کیا۔ اُس نے بھی خوشی سے فٹ بال اچھالا جو ماتھے پر لگ کر نیچے گرا اور ٹانگوں کے حلقے میں آ گیا جس

پر ننھی منی ہتھیلیاں زور زور سے پڑنے لگیں۔اُس نے آگے بڑھ کر پوتے کو اُٹھالیا جس نے بوسہ دینے کی کوشش میں گال تھوک سے بھر دیا اور دادا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

’’یہی بتاشا ہے۔ہاں۔یہی بتاشا ہے۔‘‘

وہ کافی دیر پوتے کے ساتھ کھیلتا رہا اور جب تک وہ ننھے فرشتے کے ساتھ رہا، ذہن محفوظ رہا اور گھاؤ بھی بھرتے رہے مگر جیسے ہی وہ ٹی وی لاؤنج میں آیا، بہو پر نظر پڑتے ہی یلغار ہوگئی اور اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا کہ تمہارے خیال میں زندگی کیا ہے؟

’’یہی جو گزر رہی ہے۔‘‘ ساس کو پلٹی دینے والا ڈرامہ دیکھنے میں مصروف بہو نے سوال اُڑا کے رکھ دیا تو وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا آیا جہاں بیوی نے بہو کو انگلیوں پر نچانے والا سوپ پلے ٹی وی پر لگایا ہوا تھا۔اُس نے رسمی بات چیت کے بعد وہی پوچھا اور اب کے جواب ملا تو اُسی انداز میں مگر تھوڑا مختلف کہ یہی جو گزار دی۔اُس کا اور بچوں کا اچھا خیال رکھا اور ساتھ رہی۔اُس نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے زیرِ لب کہا۔’’ہاں ساتھ رہی مگر ساتھی نہ بن سکی۔‘‘ آنکھیں موندلیں اور اُلٹی سیدھی سوچیں سوچتا سو گیا مگر نیند میں بھی لہر برقرار رہی۔

کیا تنہائی واقعی اتنا بڑا مسئلہ ہے؟نہیں۔شاید یہ خرابی کی جڑ نہیں بلکہ اسے قبول نہ کرنا جیون اجیرن کرتا ہے۔ہاں۔یہی بات ہے ورنہ بڑے بوڑھے تنہائی کے فضائل بیان کرتے نہ مرتے۔۔۔آج اُس سے ملنا چاہیے۔صدیاں بیت گئی ہیں۔اب تو اُس کے شفاف چہرے پر وقت کی سلوٹیں پڑ چکی ہوں گی یا اُس کے ابھرے ہوئے روئی سے نرم گال دھنس چکے ہوں گے۔پتا نہیں۔میری بھی تو گنج نکل آئی ہے،تو ند نہیں بڑھی تو کیا ہوا۔

ہاں۔اُسی سے بات کرنی چاہیے۔وُہ زندگی کو زیادہ بہتر دیکھ لیتی تھی جیسی کہ یہ ہے اور میں ایسے دیکھتا جیسی کہ یہ ہونی چاہیے مگر کبھی صحیح معنوں میں جان نہ سکا کہ کیسی ہونی چاہیے؟

''تُم آج بھی وہیں کھڑے ہو۔سب کچھ تو ہے تمہارے پاس۔۔۔خدا جانے کیا چیز تمہارے اندر کا خلا پُر کرے گی۔سب تم سے خوش۔بچے بھی خوشحال۔پوتے کی قلقاریاں بھی کافی نہیں تمہارے لیے؟حیرت ہے۔''

''تمہاری مسکراہٹ اب بھی پیاری ہے مگر۔۔۔اور تمہاری لمبی پلکیں اور محرابی ابرو بھی نینوں میں بسی اُداسی سے نظریں پھسلانے میں ناکام ہیں۔''

''شاید۔مگر تُم بھول گئے میں ہر حال میں خوش رہ سکتی ہوں۔''

''جھوٹ۔پہلے بھی یہی کہتی تھی۔آج بھی یہی۔۔۔''

''سچ۔بالکل سچ۔میں خود سے خوشی کشید کرنا جانتی ہوں۔تُم بھی کوشش کرو۔''

''اچھا۔کچھ کرتا ہوں۔ہاں۔یاد آیا،وہ کیا نام تھا اُس کا بھلا سا۔۔۔؟جو کہتا تھا کہ موجود سے غیر موجود کی جستجو ہی خوشی ہے۔''

''مجھے نہیں پتا۔پہلے یہ تو جان لو کہ تمہیں چاہئے کیا؟عمر گزار دی اور یہی پتا نہیں چلا تمہیں۔ساری دنیا پر نظر رکھتے ہو،خود پر نگاہ ڈالی ہوتی تو تمہاری چندیا چمکتی نہ بچے کھچے بال سفید ہوتے۔''

''ہوں۔کچھ کرتا ہوں۔''

''ناں۔کچھ نہ کرو۔بس جیو۔ہر لمحہ جیو،اپنوں کے ساتھ۔۔۔پوری طرح ساتھ۔۔۔تو شاید وہ خلا بھی بھر جائے جو تُم نے خود پیدا کیا۔''

''ٹھیک۔''

''کیا ٹھیک؟خیر چھوڑو،بس اپنی آواز سنو۔''

اپنی آواز۔۔۔اتنی آوازوں کے شور میں اپنی آواز۔۔۔اور اُس نے ہاتھ سر کے پیچھے لے جا کر چاندی کے تار چھوئے ہی تھے کہ ٹی وی پر خبر چلنے لگی اور وہ ہڑبڑا اُٹھا۔خبر تھی کہ قیامت نامہ۔۔۔

ناظرین جیسا کہ آپ ویڈیو میں دیکھ سکتے ہیں کہ مشتعل ہجوم۔۔۔

موٹی موٹی آنکھوں، کِھلتی رنگت، گھنی مونچھوں، چوڑے سینے والا تنومند اور سرو قد نوجوان نسل در نسل غلامی سے تنگ آ کر بولنے کا گناہِ عظیم کر بیٹھا تھا۔ پہلے اُسے چُپ کرانے کی کوشش کی گئی مگر وہ تھک چُکا تھا جبر سہتے سہتے۔۔۔حق مانگتا رہا اور مانگتا رہا۔ وہ زبان بندی کی کوشش کرتے رہے مگر بات اُس وقت نا قابل برداشت ہوگئی جب اُس نے زرداروں کی بھتہ خوری کے خلاف لوگ اکٹھے کرنے کی ٹھان لی اور اِس سے قبل کہ وہ مجمع لگاتا، اُنھوں نے ہجوم اکٹھا کرلیا جو کبھی عقیدت کی اوٹ لے کر اور کبھی طاقت کے زور پر گندا دھندا کرتے رہتے ہیں، اور انھوں نے مشہور کر دیا کہ اُس نے اپنے پلید منہ سے انتہائی پلید لفظ نکالے ہیں۔توبہ توبہ۔۔۔ایسے بول بولنے والے کو سنگسار کر دینا چاہیے۔اس کی صرف ایک ہی سزا ہے۔۔۔اور اُسے گولی سے گرا دیا۔اُس کے ساتھیوں میں سے بھی کسی نے کچھ پوچھا نہ سوچا ،لکیر کے فقیر بن گئے اور جس کے ہاتھ جو لگا، مارنے لگا اور مارتا رہا حتیٰ کہ وہ مر گیا مگر کسے پروا تھی سو مارتے رہے۔اِس پر بھی ٹھنڈ نہ پڑی تو ننگا کر کے گھسیٹتے رہے، سنگ باری کرتے رہے اور قانون کے رکھوالے قانون کے ساتھ زنا بالجبر دیکھتے رہے لیکن وہ زیادہ دیر نہ دیکھ سکا اور رگوں اور نسیجوں کو پھٹنے سے بچانے کے لیے رو دیا۔بالکل بچوں کی طرح رویا اور بچوں کی طرح ہی روتے روتے سو گیا۔نیند میں اُس نے وُہ کام کیا جو جاگتے میں کرنا اُس کے بس میں نہ تھا اور ابھی اطمینان کی سانس نہیں لے پایا تھا کہ وُہ آ گئی جس کے آنے کی راہ میں وہ راتوں کو جاگتا تھا اور آتے ہی ہجوم کے خلاف ہذیانی کیفیت میں چلانے لگی، بوچھاڑ میں سب کو لپیٹا اور آخر میں اُس کو بھی بے نطق سناتے چل دی۔وُہ اُسے اندھیری اور سنسان راہ پر سر جھکائے ہولے ہولے قدم اٹھاتے، دور جاتے دیکھتا رہا۔اوجھل ہونے کے بعد بھی ٹھیک وہیں کھڑا رہا، بہت دیر، یہاں تک کہ شفق پھولنے لگی اور جھلمل میں اُسے اپنی اور آتے محسوس کیا۔سکوت کا طلسم ٹوٹا تو نہاں خانوں میں بھی ارتعاش ہوا۔

’’پہلے شک تھا، اب یقین ہو گیا، تُم واقعی پاگل پن کی دہلیز پر کھڑے ہو، جہاں زندگی ہی نہیں وہاں معنی کی تلاش چہ معنی دارد؟‘‘

’’معانی ہوں گے تو زندگی رہے گی، بانو!‘‘ اُس نے کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا کہ وہ کالی آنکھوں میں سفید موتی لیے دو قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اُس کا جی چاہا کہ رخساروں پر چمکتے دانوں سے تسبیح بنالے اور درد کے رشتے کی سلامتی کا وِرد کرتا رہے جو انسان کو خچر اور خچر کو انسان بنا دیتا ہے۔

انتیس اپریل دو ہزار سترہ عیسوی

انسان نما

رفیق پڑھائی مکمل کر کے نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن کہیں بات نہ بنی۔ جہاں امید نظر آتی وہاں تنخواہ اتنی کم بتائی جاتی کہ وہ صحیح طرح کوشش بھی نہ کرتا۔ رفیق کے والد نے، جو پرچون فروش تھے، ایک سال بیٹے کی نوکری لگنے کا انتظار کیا اور دوسرے برس کے آغاز میں ہی رفیق کو اپنا چھوٹا موٹا کام کرنے کے لیے زور دینے کے ساتھ دُکان پر وقت بِتانے کے لیے مجبور کرنے لگے۔ رفیق کچھ مہینے کڑھتے ہوئے دُکان پر کام کرتا رہا اور روتے دھوتے گُر بھی سیکھ گیا۔

نئے ہوائی اڈے کو جانے والی سڑک پر نئی آبادی باقاعدہ منصوبے کے تحت بسائی گئی جس میں رہائش کے لیے تگڑی رقم کی ضرورت ہوتی اور اسی پوش نگری کے پاس غرباء نے بھی آہستہ آہستہ اپنی بستی بسالی۔ اِن دو آبادیوں کے درمیان ایک گندا نالا بہتا تھا جس میں دونوں طرف کا فضلہ گرتا تھا۔ امیر کہلانے والوں کی سوسائٹی کے ساتھ ساتھ گندا نالا کنکریٹ بچھا کر ڈھانپ دیا گیا اور اس کے ساتھ سڑک بھی بچھا دی گئی تھی جس کا فائدہ دوسری طرف رہنے والوں کو بھی ہوا۔ غریبوں کی طرف سے جو مکان بدرو کے قریب تھے، اُن میں دکانیں بنائی گئیں اور انہی میں سے ایک مکان کی چار دُکانوں میں سے ایک کاسمیٹکس کی تھی جس کے باہر رفیق نے اپنا کاؤنٹر سجا لیا اور میٹھی گولیاں، ٹافیاں اور چاکلیٹ جیسی چیزیں فروخت کرنے لگا۔ اس کے کاؤنٹر پر پہلے عام لوگوں کے بچے آتے تھے لیکن بعد میں خود کو خواص سمجھنے والوں کے بچے بھی بکری بڑھانے لگے۔ سڑک کے دونوں طرف سے بچوں کی آمد پر

اُس نے سستی کے ساتھ مہنگی ٹافیاں بھی رکھنا شروع کر دیں اور بات صرف میٹھی گولیوں تک محدود نہ رہی۔ وہ اکبری منڈی سے کھانے کی ایسی ایسی اشیاء ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتا کہ بچے بھاگے بھاگے آتے۔

کاؤنٹر سجائے سال پورا نہیں ہوا تھا کہ رفیق کو دُکان کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور اسے یہ کام بھی پسند آ گیا ورنہ پہلے چھ ماہ وہ روز اخبار میں نوکری کے اشتہار ڈھونڈتا اور درخواستیں بھیجتا رہا تھا۔ جب اُسے نئی سڑک کے قریب دکان ڈھونڈتے دو مہینے ہونے کو آئے تب کاسمیٹکس سٹور کے ساتھ والی دُکان خالی ہو گئی جو رفیق نے والد کی مالی مدد سے کرایہ پر لے لی۔

رفیق نے دُکان میں بھی پہلے بچوں کی چیزوں کو ترجیح دی اور اس کے بعد اپنی جیب کے مطابق گھریلو استعمال کی اشیاء تھوڑی تھوڑی لانا شروع کر دیں جنہیں وہ تول کر چھوٹے چھوٹے لفافوں میں بھر کے رکھتا جس سے دُکان اُس کی ترتیب میں آتی زندگی سے زیادہ بجی نظر آنے لگی اور سڑک کے اطراف میں بسے لوگ جو بچوں کو ٹافیاں دِلانے آتے تھے، اشیائے خوردنی بھی خریدنے لگے۔

رفیق کو دُکان ڈالے پانچ سال پورے نہیں ہوئے تھے کہ کاسمیٹکس سٹور سمیت تین دوسری دُکانیں بھی اُس کے استعمال میں آ چکی تھیں اور اُس کی دُکان اب جنرل سٹور بن چکی تھی جہاں سے نئی سڑک کی ہری بھری جانب بسنے والے لوگ تیس تیس ہزار کا راشن لے جاتے تھے اور پچھلی طرف سے تیس روپے کا سودا لینے والے بھی آتے تھے۔ پہلے وہ خود نوکری ڈھونڈتا تھا، اب اُس کے پاس چھ ملازم تھے۔ ایک سال ہی اور گزرا تھا کہ رفیق نے وہ مکان بھی خرید لیا تھا جس میں اُس کا سٹور تھا۔ مکان کا پچھلا حصہ رفیق نے گودام بنا لیا۔ رفیق کے والد جب پہلی بار مکان دیکھنے آئے تو بولے۔

''اوئے کھوتے، تیرا اک بھرا وکیل اے تے دوجا حساب کتاب کرداا ے پر اصلی ترقی

تے توں کیتی اے۔ ہون میں تیرا وی ویاہ کر دینا اے ایسے مہینے۔'' رفیق نے والد کی بات پر خوشی کا اظہار کیے بغیر اپنے میں اطمینان کی ایک لہر دوڑتی محسوس کی کیونکہ زندگی میں پہلی بار اسے ایسا محسوس ہوا کہ باپ کو بیٹے پر فخر ہے۔ اُس کے والد نے محض خوشی میں شادی کا عندیہ نہیں دیا تھا بلکہ اپنا قول پورا بھی کر دیا۔ بیاہ کے بعد چند مہینے تو خیر خیریت سے گزرے لیکن گھر، جو اصل میں عورتوں کا ہوتا ہے، مردوں کے لیے تو مسافر خانہ ہوتا ہے، کی پرانی اور نئی عورتوں میں چپقلش اتنی بڑھ گئی کہ والد نے وکیل اور اس سے چھوٹے رفیق کو دو مہینے میں اپنا اپنا بندوبست کرنے کا کہہ دیا، صرف چھوٹے حسابی کتابی بیٹے کو ساتھ رکھنے کا فیصلہ سنایا کیونکہ وہ ابھی کنوارا تھا۔

رفیق نے مکان کی تلاش نئی سڑک کی اُس جانب شروع نہ کی جس طرف اس کا سٹور تھا بلکہ سامنے والی آبادی میں ڈھونڈا۔ اس مکان نما کوٹھی کی خریداری کے لیے رفیق کو بیوی کا زیور بھی بیچنا پڑا اور وراثت سے زیادہ حصہ ملنے کے باوجود قرض لینا پڑا جو اُتارنے میں اُسے سال تو لگا لیکن اُس کی بیوی کا گھر بن گیا جو دراصل ایک مختصر سی کوٹھی تھی۔

اِس مکان نما کوٹھی میں پہلی بار قدم رکھتے ہی جس چیز نے اُس کے اَبا کو متوجہ کیا، وہ تھی بیٹھک۔۔۔ اسی کی وجہ سے وہ کوٹھی نہیں تھی بلکہ مکان نما کوٹھی تھی اور اسی کے سبب قیمت کم تھی لیکن رفیق کے والد کو بیٹھک پسند بہت آئی اور اُس نے پہلی بات ہی قہقہہ لگاتے ہوئے اِسی کے متعلق کی۔

''اوئے! تُو پیو دے گھر وی بیٹھک چ رہندا سی۔ ایتھے وی بیٹھک ملے گی۔''

اگرچہ مکان نما کوٹھی کی بیٹھک آبائی گھر جیسی نہ تھی جہاں بیٹھنے سے گلی میں ہوتی چہل پہل اور پڑوس میں ہونے والی تو تکار کی خبر رہتی تھی، یہاں تو بغل میں رہنے والوں کا کچھ پتا نہ چلتا، لیکن وہ دوپہر کو سٹور سے واپسی پر بیٹھک میں ہی ڈیرہ ڈالتا۔ ایک روز وہ لیٹا ہی تھا کہ نیند کے ہلکورے لینے لگا گو وہ اپنے تئیں بیدار تھا لیکن سویا ہوا تھا اور معلوم نہیں کتنی دیر

خواب میں رہتا کہ کسی کی کانوں کے پردے پھاڑ کر سینے میں گھس جانے والی آواز آئی۔

''نی باجی، نی باجی، روٹی کھانی اے۔ اللہ دا واسطہ ای۔ نی باجی، روٹی کھانی اے۔''

رفیق نے کروٹ بدل کر نیند میں رہنے کی کوشش کی مگر وہ آواز مسلسل آ رہی تھی۔

''نی باجی، نی باجی۔۔۔''

وہ آنکھیں ملتے ملتے اُٹھ بیٹھا اور بیوی کو آواز دی، ''کچھ دو اور چلتا کرو۔'' بیوی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جواب دیا، ''کتنوں کو دوں؟ سارا دن لائن لگی رہتی ہے۔ ہر بندہ ہی بھکاری بن گیا ہے۔ میں کیا کروں؟''

رفیق نے بیوی کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو 'اچھا جیسے آپ کی مرضی' اور دوبارہ لیٹ گیا۔ اُس کی آنکھیں چھت میں لٹکتے پنکھے کے پروں کو گھور رہی تھیں لیکن کان باہر کی طرف متوجہ تھے۔ پہلے اسے آواز ہلکی ہوتی محسوس ہوئی اور پھر بالکل بند ہو گئی۔ اُس نے سکون کا سانس لیا کہ چلو کچھ دیے بغیر ہی گزارا ہو گیا۔ وہ بیوی کو کھانا لگانے کا کہہ ٹی وی دیکھنے لگا جس پر خبریں پڑھی جا رہی تھیں لیکن نیوز کاسٹر خبر سنا کم اور گلا پھاڑ پھاڑ کر اعلان زیادہ کر رہا تھا جیسے سیاسی جلسے میں تقریر کر رہا ہو۔ وہ خبروں والے چینل مسلسل بدلتا رہا مگر سب اسے ایک جیسے لگ رہے تھے۔ کچھ نہ بھایا تو اُس نے ٹی وی کی آواز بند کر دی اور تبھی وہ آواز کانوں سے دوبارہ ٹکرانے لگی۔

''نی باجی، نی باجی۔۔۔''

وہ آواز کے گھٹنے بڑھنے پر غور کرنے لگا۔ آواز پہلے ہلکی تھی پھر تیز ہونے لگی۔۔۔ لمحہ بہ لمحہ۔۔۔ اور اس قدر بلند ہو گئی کہ بیٹھک کی دیوار کے دوسری طرف کوئی کھڑا پکار رہا ہو۔ اسی دوران میں رفیق کی بیوی ٹرالی پر کھانا سجائے آ گئی۔ اُس کے سامنے کھانا پڑا تھا اور کوئی آواز لگا رہا تھا۔

''نی باجی، نی باجی، روٹی کھانی اے۔۔۔''

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھا، بیوی نے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ بیٹھک سے نکلا، بڑے گیٹ میں نصب چھوٹا دروازہ کھول دیا اور صدا دینے والا سامنے آن کھڑا ہوا جو پہلے بیٹھک کی طرف ہی کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے سے میک اپ کا لیپ یوں اکھڑ رہا تھا جیسے رفیق کے اَبا کے آبائی گھر میں غسل خانے کی دیوار سے ڈسٹمپر کی پپڑیاں بن کر جھڑتی رہتی تھیں جو بہتیرے ٹوٹکے اپنانے کے باوجود سیلن کے باعث ٹھیر نہ پاتی تھیں۔ وہ گھر جو چھوٹ گیا تھا، جس سے دُکھی یادیں وابستہ تھیں، جس سے بچپن کا سکھ بھی جڑا تھا، چھوڑنا پڑا مگر وہ اب تک اس کے گھیرے میں تھے جس کے اندر ایک نوری ہیولا سکڑتا نظر آتا تھا۔

اُس نے غسل خانے کی یاد دِلانے والے سترہ اٹھارہ سال کے شبیر احمد کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ سر پر سفید دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا اور مردانہ شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ جگہ جگہ سے داغی قمیص کا ایک کونا بائیں ہاتھ سے مسلے جا رہا تھا اور رفیق کو یوں دیکھ رہا تھا کہ خود ہی کچھ دے دے لیکن رفیق اُسے جانچنے میں مصروف تھا اور چند لمحوں میں سب جان لینا چاہتا تھا۔

رفیق کے سٹور پر روز درجن بھر مانگنے والے آتے تھے اور ہر ایک کے لیے رفیق نے پانچ روپے کے سکے رکھے تھے۔ ایک ملازم کی ڈیوٹی تھی کہ وہ ہر آنے والے کو سٹور کے باہر کھڑے کھڑے بھگتا دے۔ اُس نے کبھی کسی کو پانچ روپے سے زیادہ نہیں دیے تھے سوائے کوئی بوڑھا یا بوڑھی آ جائے۔ اُس کی بیوی بھی گھر آنے والوں کے ساتھ یونہی پیش آتی تھی، کبھی کسی کو پانچ روپے سے زیادہ نہیں دیتی تھی مگر جاننے والوں پر اچھا خاصا خرچ کر لیتی تھی جیسے رفیق بھی ایک دو گھروں میں ہر مہینے راشن بھجواتا تھا لیکن مانگنے والوں کو علیحدہ خانے میں رکھتا تھا۔۔۔ دل میں اُن کے لیے غصہ پاتا اور نہ چاہتے ہوئے سکے بھی دیتا تھا۔ میاں بیوی کو مشکل اس وقت پیش آتی تھی جب کوئی پانچ روپے لینے سے انکار کر دیتا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ اِس کے بھی عادی ہو گئے اور انھیں خود بخود پتا چل جاتا کہ انکاری کو زیادہ دینے چاہئیں یا نہیں گو ایسا موقع کبھی کبھار ہی آتا جیسے اِس وقت رفیق طے نہیں کر پا رہا تھا

کہ پانچ روپے کا سکہ دے یا زیادہ نکالے؟ اور زیادہ دے تو کتنے؟ دس۔۔۔بیس۔۔۔پچاس؟ اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر راندۂ درگاہ کے گلے سے وہی آواز گھسٹتے ہوئے نکلی۔

''صاب جی، وے صاب جی، روٹی کھوا دے۔''

رفیق نے سوچنا ترک کیا، مُٹھی میں دبا پانچ کا سکہ بغل کی جیب میں ڈالا، اُسے رکنے کا کہہ کر اندر گیا اور واپس آ کر پچاس کا نوٹ پکڑا دیا جسے شبیر نے پکڑتے ہوئے دعائیں دینے کے بجائے التجا کی۔

''صاب جی، روٹی نئیں مل سکدی؟''

رفیق کو غصہ آ گیا، ''پچاس روپے دیے تو ہیں۔اور کیا دوں؟''

وہ ڈرتے ڈرتے بولا، ''صاب جی! ایس علاقے چ تے اپنے دی دال دی پلیٹ نئیں ملدی۔تسی روٹی دے دیو۔'' اُس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ''اے لو۔پیسے رکھ لو۔''

رفیق اُس کی بات سن کر لاجواب ہو کر بیٹھک میں گیا اور سرہانے کے نیچے پڑے نوٹوں میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال لایا جو اُس نے مردودِ حرم کی طرف مسکراتے ہوئے بڑھا دیا۔شبیر نے نوٹ کو دیکھا اور پہلے سے زیادہ ڈرتے ہوئے کہا، ''صاب جی! روٹی آکھی سی۔تسی۔۔۔''

''روٹی کے لیے ہی دے رہا ہوں۔''

''اچھا۔صرف روٹی لئی؟''

''ہاں۔ہاں۔صرف روٹی لئی۔کیوں؟

''کدی کسے نے صرف روٹی لئی اپنے پیسے دتے نئیں۔'' شبیر نے نوٹ پکڑتے ہوئے کہا تو رفیق کا ہاتھ لرز گیا۔اُس نے منہ سے چند الفاظ نکالنے کی کوشش کی اور ناکامی پر ہونٹ بھینچ لیے۔ایک پل میں محسوس ہوا کہ کسی نے زمین پر پٹخ دیا ہے اور دوسرے لمحے شبیر پر ترس آ رہا تھا کہ اسے کیسے کیسے گھسیٹا گیا۔اس نے دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کہہ نہ سکا

اور اپنی قمیص کا داہنا کونہ مسلنے لگا جیسے اس کے سامنے چپ چاپ کھڑا شبیر باہنے کنارے کو انگلیوں سے رگڑ رہا تھا۔ یہ عمل نجانے کتنی دیر خاموشی سے جاری رہتا کہ پیچھے سے رفیق کی بیوی نے تیسری بار کھانے کے لیے پکارا تو اُس نے گردن گھما کر ٹھیرنے کے لیے کہا اور دوبارہ شبیر کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے چند ثانیے بعد ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا، اندر جا کر بیوی سے بیٹھک خالی کرنے کے لیے کہا، واپس گیٹ پر آیا اور اُسے بازو سے پکڑ کر ساتھ لے گیا۔

اگلے دن رفیق کے سٹور پر ملازموں کی تعداد بڑھ چکی تھی اور شبیر لپک لپک کر چیزیں پکڑا رہا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے بال کٹ چکے تھے۔ سر سے دوپٹہ غائب تھا۔ شلوار قمیص نئی تو نہ تھی البتہ صاف تھی۔ اُس کے چہرے پر نمی سے اکھڑنے والا پلستر بھی نہیں تھا مگر خراشوں کے نشانات باقی تھے۔ وہ پہچانا نہیں جا رہا تھا لیکن شکاریوں کے لیے شناخت مشکل نہ تھی جو بھرے بازار میں جان لیتے ہیں کہ کس عورت سے پیسے پوچھنے ہیں اور کس سے کترا کے نکل جانا بہتر ہے یا کون سی شریف زادی زیادہ اُچھل رہی ہے۔ وہ بھی سب کے سامنے ٹھیک تھا لیکن ایک ساتھی اُسے ۔۔۔ اور باقی رفیق کو کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ ساتھی جو شبیر کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، بعد میں اُس کا دوست بن گیا گو اس نے آغاز میں گھیرنے کی کوشش کی لیکن جلد اسے معلوم ہو گیا کہ وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس نئے دوست کو ہر ماہ کے آخر پر پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی جو شبیر تھوڑی بہت پوری کر دیتا جیسے وہ گودام، جو اس کا گھر ٹھیرا تھا، میں چوہے پکڑنے کے لیے رکھی گئی بلی کی دودھ کا کٹورا بھر کر خوراک پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ پہلے پہلے جب بلی کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرتا تو وہ کھسک جاتی لیکن چند دن میں اتنی مانوس ہوئی کہ اس کے پاس بیٹھنے لگی۔ جب بلی جیسا نک چڑھا جانور سدھ سکتا ہے تو سٹور پر کام کرنے والے ساتھی کیوں نہ رویہ بدلتے۔

اُسے سٹور پر کام کرتے چند ماہ گزرے تھے کہ رفیق کو اُس کے دس جماعتیں پاس

ہونے کا علم ہو گیا اور رفیق نے شبیر کی ڈیوٹی مختلف چیزوں پر نظر رکھنے پر لگا دی۔ایک رات سٹور بند کرتے وقت اُس نے مزید پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اوقات کار میں کچھ تبدیلی کی درخواست کی تو رفیق نے اُسے سوچنے کا کہہ کر ٹرخا دیا لیکن گھر آ کر جب وہ سونے کے لیے لیٹا تو اُسے اپنا وہ استاد یاد آ گیا جو اُسے کبھی مفت ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا۔ان دنوں رفیق کا خاندان قصور سے نیا نیا لاہور آیا تھا اور مالی حالت بڑی پتلی تھی۔۔۔اِس قدر کہ اُسے دودھ دہی کی دُکان پر کام کرنا پڑتا جہاں استاد اسے بطور گاہک ملا تھا اور وہ یہ جان کر حیران ہوا تھا کہ وہ اکیلا نہیں جو فیض پا رہا ہے۔

ہر رات کے بعد دن آتا ہے جیسے رفیق کی زندگی میں آیا تھا، جیسے شبیر کے لیے پو پھٹ رہی تھی۔وہ کالج جانے لگا تھا جہاں اُسے بُری طرح ستایا گیا لیکن وہ ایک اصلی مرد کی طرح ڈٹا رہا اگرچہ وہ نہیں رہا تھا جیسا سمجھا جاتا ہے۔وہ کالج سے سٹور آ جاتا اور رات کو گودام میں اِس آس پر بے سدھ سو جاتا کہ ایک دن وہ سویرا ہو گا جو تاریکی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا اور بلی اُسے اپنے پنجوں سے جگا دیتی تا کہ وہ وقت پر اُسے کچھ کھلا سکے اور خود کالج جا سکے۔یہی دور تھا جب اسے رفیق کا کارِ خاص ٹھیرا دیا گیا۔رفیق اکثر اُس کی باتیں اپنی بیوی سے کرتا تھا جو پہلے حیران ہوتی اور ٹوہ لینے کی کوشش بھی کرتی تھی لیکن جب اُسے یقین ہو گیا کہ رفیق ہم جنس پرست نہیں تو وہ بھی شبیر کی مدد کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کرنے لگی۔

شبیر کی قسمت اچھی تھی یا وہ بڑا ڈھیٹ تھا کہ ہار نہیں مانتا تھا۔اِتنی ڈھٹائی کا کچھ نتیجہ تو نکلتا ہے۔۔۔کبھی اچھا۔۔۔کبھی برا۔۔۔ایک دن وہ سٹور پر آیا تو اُس کے ہاتھ میں مٹھائی کے دو ڈبے تھے۔ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا۔۔۔بڑا اُس نے رفیق کے آگے رکھا جسے وجہ پوچھتے ہوئے رفیق نے کھولا تو شبیر نے خوشی سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے بتایا کہ وہ گریجوایٹ ہو گیا ہے۔رفیق نے باقی ملازموں کو بلا کر شبیر کی کامیابی کا اعلان کیا اور مٹھائی بانٹی۔چند منٹ پر مشتمل یہ پارٹی ختم ہوئی تو شبیر نے چھوٹا ڈبا رفیق کو گھر والوں کے لیے پکڑا

دیا جس پر اُس نے حیرانی کے ساتھ دیکھا، کچھ سوچ کر شلوار کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے چند نوٹ نکال کر شبیر کے ہاتھ میں تھما دیے جو اُس نے ناں ناں کرتے ہوئے لے لیے۔

رفیق کے سٹور میں دو سال بعد پھر مٹھائی بٹ رہی تھی۔ اب شبیر پوسٹ گریجوایٹ ہو گیا تھا۔ اِس کے بعد بھی ایک بار مٹھائی تقسیم ہوئی تھی جب اُس نے بتایا کہ وہ ایک سرکاری ادارے میں ملازم ہو گیا ہے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''سر جی! کبھی کا غذات کی تصدیق کروانی ہو تو میں خادم ہوں۔''

رفیق نے ملازموں کی موجودگی میں اپنی سیٹ سے اُٹھ کر اُسے گلے لگایا تھا اور شبیر کی آنکھوں سے نکلے کسیلے پانی نے رفیق کے کالر پر دو آنکھیں بنا دی تھیں جو شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ رفیق کو خوشی تھی کہ اُس نے برسوں پہلے صحیح فیصلہ کیا تھا اور اس جشن منانے کے لیے ملازموں کو کوٹھی میں رات کے کھانے کی دعوت دی جس کے اختتام پر شبیر نے رفیق کو بتایا کہ اب وہ جلد کہیں کرائے پر کمرہ حاصل کر لے گا لیکن رفیق نے اسے کہا، ''وہ جب تک چاہے، گودام میں رہ سکتا ہے۔''

رات گئے جب شبیر قبرستان کی طرح خاموش بستی کی پُر رونق کوٹھی سے نکلنے لگا تو بے اختیار رفیق کے گلے لگ گیا اور اب کی بار شکر گزار آنکھوں کے ساتھ ساتھ مسکراتے ہونٹ بھی بنا دیے۔

اُس نے چند ہفتوں میں رہنے کے لیے ایک مکان ڈھونڈ نکالا جو سٹور کی پچھلی طرف بسی آبادی میں واقع تھا لیکن سامنے والی کالونی میں رہنے والے مالک مکان کو وہ گھر کرایہ پر دینے میں تامل تھا مگر رفیق کی ضمانت پر مان گیا۔

وہ اتوار کے روز سٹور پر چکر لگاتا اور ضرورت کی چیزیں خریدنے کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر رفیق سے گپیں بھی ہانکتا تھا۔ رفیق نے اسے کئی بار کہا کہ دفتر سے واپسی پر اس کے پاس

سٹور پر آجایا کرے لیکن وہ اتوار کے اتوار ہی آتا۔ ایک دن رفیق کی نگرانی میں ملازم سٹور بند کر رہے تھے کہ وہ نمودار ہو گیا۔ رفیق نے اُسے حیرانی سے دیکھا کہ آج اتوار نہیں تو یہ یہاں کیسے آگیا؟

''خیر تو ہے؟''

شبیر نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور رفیق کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ جب سٹور بند ہو گیا اور ملازم اپنی اپنی راہ ہو لیے تو رفیق نے بھی سڑک پار کرنے کے لیے قدم اٹھایا لیکن اُس نے ہاتھ پکڑ کر پچھلی جانب جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو رفیق اس کے ساتھ چپ چاپ چل پڑا۔

''سر جی! آپ کو یاد ہے کہ جب میں آپ سے پہلی بار ملا تھا؟''

''ہاں۔ اچھی طرح یاد ہے۔''

''اُس دن مَیں پہلی مرتبہ اس علاقے میں آیا تھا۔'' شبیر نے اپنا گال کھجاتے ہوئے رفیق کو غور سے دیکھا اور دوبارہ گویا ہوا۔'' مجھے گرو نے بڑا برا بھلا کہا تھا۔ گروپ کے دوسرے لوگ بھی ناراض تھے۔ مَیں اُن پر بوجھ بن گیا تھا۔ اس لیے مَیں اِدھر آ گیا کہ چلو مانگ کر کچھ کھا لیتے ہیں۔۔۔ وہ کام ضرور کرنا ہے جو کرنے کو من نہیں کرتا لیکن مجبوری میں کرتا رہا۔'' شبیر سانس لینے کو رکا تو رفیق نے جھٹ سے پوچھا۔

''یہ گرو کون تھا؟''

''وہ بس گرو تھا۔ یوں کہہ لیں مائی باپ تھا۔ میٹرک اُسی نے کرایا تھا۔۔۔ پرائیویٹ۔۔۔ جس دِن نتیجہ نکلا تھا، اُسی روز میری ایسی تیسی کر دی اور میں نے گروپ چھوڑ دیا۔ اچھا بندہ تھا، بس کبھی کبھی پھر کی گھوم جاتی تھی اُس کی۔۔۔''

رفیق نے راکھ کریدنے کی کوشش کی،'' تم نے کبھی اپنوں کے متعلق بتایا نہیں۔ ماں باپ،، بہن بھائی؟''

’’سر جی! آپ نے کبھی صحیح طرح پوچھا ہی نہیں تو بتاتا کیا؟‘‘

وُہ چلتے چلتے رُک گیا اور اندھیرے میں آسمان کو تکنے لگا جہاں گہرے بادلوں نے چاند کو چھپا دیا تھا اور بہت دُور اِک تارا اکیلا نظر آ رہا تھا۔ خبر نہیں وہ کب تک یونہی دوسرا تارا تلاشتا کہ رفیق نے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس نے کہا، ’’ہوں ۔۔۔ سر جی! آج سن لیں۔ میں چھوٹا سا تھا جب گلی میں کھیلتے ہوئے اغوا ہو گیا۔ گرو کہتا تھا میں اغوا نہ بھی ہوتا تو میرے گھر والے ہی مجھے کسی کو دے دیتے۔ بھلا وہ کیسے کسی کو دے دیتے۔ گرو کو مجھ میں پہلے سے کسی کمی کا یقین تھا مگر مجھے لگتا ہے کہ ہماری گلی میں بے سرا گا کر ۔۔۔ بے ڈھنگا ناچ کر پیسے اکٹھے کرنے والے گرو نے مجھ میں کوئی خرابی ڈالی تھی۔ شبیر سے شبانہ کیا تھا۔‘‘ اُس نے گہری سانس لی اور دوبارہ بولا۔

’’کئی سال بعد جب گھر لوٹا تو مَیں، مَیں نہ رہا تھا، انسان نما بن چکا تھا اور موت کے گولے کے گرد ناچ ناچ کر پیسے کمانا میرا پیشہ ہو چکا تھا۔ میرے ابا ۔۔۔ ابا مر چکے تھے اور ۔۔۔ ابا سے پہلے ماں کب کی دم توڑ چکی تھی۔ گھر میں ایک عورت تھی جسے میری سوتیلی ماں بتایا گیا۔ دوسری عورت میری سگی بہن تھی۔ وُہ ۔۔۔ ہاں وہ میری بہن تھی۔ بڑا روئی تھی گلے لگ کر ۔۔۔ میں بھی رویا تھا جی ۔۔۔ ہائے ۔۔۔ کتنا رویا تھا میں ۔۔۔‘‘ شبیر پر خاموشی چند لمحوں کے لیے طاری رہی اور وہ خالی ہاتھوں کی ہتھیلیاں باہم رگڑ کر حرارت سے قوت کشید کرتے ہوئے بولا۔

’’اُس کی دو مہینے بعد شادی ہو گئی۔ یہ دو مہینے بھی میں گھر میں نہیں رہا تھا۔ سوتیلی ماں نے رہنے ہی نہیں دیا تھا لیکن ان دو مہینوں میں مَیں نے زیادہ سے زیادہ پیسے بنانے کی کوشش کی۔ گرو سے بھی ترلے کر کے کافی رقم لی اور جہیز بنا کر دیا۔ جب میں نے روپوں کی تھیلی اسے پکڑائی تھی، وہ بڑا روئی تھی ۔۔۔‘‘

’’تو جس دن گرو نے تمھیں نکال دیا تھا۔ تم اُس کے پاس چلے جاتے۔‘‘ رفیق نے

بات کاٹی تو وہ بولا، ''نکالا نہیں تھا، سر جی۔ میں نے اُسے چھوڑا تھا۔ بہن کے پاس کیسے جاتا؟ شادی کے بعد تین بار گیا تھا۔ ہر دفعہ کچھ نہ کچھ لے کر گیا۔ تیسری بار سونے کا ہار لے کر گیا تو اس نے منع کر دیا۔ کہتی تھی، نہ آیا کرو، میری بے عزتی ہوتی ہے۔''

رفیق سوچ میں ڈوب گیا لیکن شبیر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''وہ دن اور آج کا دن۔۔۔ کبھی ماں جائی کا چہرہ تک نہیں دیکھا۔ سکھی ہوگی۔ وہ کھاتے پیتے لوگ تھے۔''

''تو اپنے ابا کے گھر چلے جاتے۔ تم وارث تھے۔''

''وہاں اور بھی کئی وارث تھے۔ میری دال کیا گلتی؟''

اُس نے زہر خند قہقہہ لگایا اور۔۔۔ اور چند خاموش ساعتوں کے بعد کپکپاتی تان اُٹھی۔

نی مائے!

اور شاہ حسین کی کافی سُروں میں ڈھل گئی۔

نی مائے! سانوں کھیڈن دے، میرا وت کھیڈن کون آسی

ایہہ جگ جھوٹا، دنیا فانی، ایویں گئی میری اہل جوانی

نئی مائے! سانوں کھیڈن دے

رفیق جذب کے عالم میں سنتا رہا اور جب آہ و زاری تھم گئی تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس نے کچھ نہیں سنا اور اُس کا ذہن دوبارہ بے عزتی کی طرف مرکوز ہو گیا۔ شبیر پر خاموشی کے خول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ صورتِ احوال کی پیچیدگی کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا جب تک ہم راہی نے اپنے لب نہ کھول لیے۔

''سر جی۔ مزے کی بات بتاؤں۔ ناچتا تھا تو ذلیل کیا جاتا تھا۔ اب افسر بن گیا ہوں مگر ذلیل ہی سمجھا جاتا ہوں۔ ہے نا مزے کی بات؟''

''نہیں۔ یار۔ ایسے نہ کہو۔ سب تمہیں سَر سَر کہتے ہیں۔''

''نہیں۔ایسی بات نہیں۔مَیں اب اچھا لباس پہنتا ہوں لیکن لوگ مجھ سے اُسی طرح گنی کتراتے ہیں جس طرح میری ماں جائی۔۔۔لوگ میرے پاس آنے سے ڈرتے ہیں ،اور جو آتے ہیں، اُن کے اِرادے نیک نہیں ہوتے۔''

''میں سمجھا نہیں۔اِرادے تو گنتی کے لوگوں کے نیک ہوتے ہیں تو اس میں پریشانی کیا ہے؟'' رفیق اُس گلی کی نکڑ پر رُک گیا جو شبیر کے گھر کو جاتی تھی اور بڑی سنجیدگی سے ہاتھ ہلا کر جواب طلب کیا۔

''سر جی! میں اُن ارادوں کی بات نہیں کر رہا جن کی آپ کر رہے ہیں۔میں سمجھتا ہوں۔جب مَیں ناچتا تھا تو مجھے 'ایسا ویسا' سمجھا جاتا تھا اور اب تک 'ویسا' ہی مانا جاتا ہوں۔ ساتھی افسروں کا برتاؤ گزارے لائق ہونے کے باوجود ٹھیک نہیں ہوتا۔مسئلے حل کرانے والوں کا رویہ بھی جو ہوتا ہے سو ہوتا ہے مگر وہ کام نکلوا کر واپس جاتے ہوئے کھسر پھسر کرتے چوری چوری مسکراتے ہیں اور آج کی بات سنیں۔دفتر سے نکلا تو سوچا، پیدل گھر جاتا ہوں۔ ذرا ورزش ہو جائے گی۔یہاں سے تھوڑی دور تھا کہ ایک کار میرے پاس آ کر رُکی اور اِس میں سے ایک بُرا سا منہ باہر نکلا جو پوچھ رہا تھا۔۔کی پروگرام اے؟۔۔اور یہ پہلی بار نہیں ہوا۔''

''تم پریشان نہ ہو۔کوئی بات نہیں۔آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رفیق نے کمر تھپکتے ہوئے کہا تو وہ بولا ''آپ سے کبھی کسی نے پروگرام پوچھا ہے؟''

''نہیں۔'' رفیق نے ترنت جواب دیا تو شبیر نے ہنسی میں کرب چھپاتے ہوئے کہا، ''پھر پریشانی والی بات تو ہے نا، سر جی۔''

رفیق نے اب کی بار کوئی سوال کیا نہ جواب دیا۔اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا، وہ بس سوچ رہا تھا اور یوں سوچ رہا تھا کہ کچھ نہ سوجھ رہا تھا اور یونہی کچھ سوچتے کچھ نہ

سوچتے وہ شبیر کے گھر پہنچ گیا جہاں ایک اور انسان نما کرسی پر بیٹھا تھا جس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب ایک طرف رکھ دی اور سلام لے کر چمکتی آنکھوں سے رفیق کو دیکھنے لگا، رفیق بھی اُس بچے کو چند لمحے حیرانی سے تکتا رہا، پھر آگے بڑھا اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر شبیر کے گلے لگ گیا اور بچوں کی طرح رو دیا۔

بیس اگست دو ہزار پندرہ عیسوی

ہیولا

یہ کہانی ہے ایک خرادیے کی جو رام کے بیٹے سے منسوب شہر کا باسی تھا۔ وہ اس شہر کی عظمت کے گیت گاتا رہا جسے شہریاروں کی نحوست نگل رہی ہے، جو ہمیشہ راج گڑھ رہا، راجہ چاہے کوئی ہو، افغان ہو یا ترک، سکھ ہو کہ ہندو، گورے اور بھورے، کوئی بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکا۔ اس کے ایک کنارے وہ بادشاہ منوں مٹی تلے خاموش ہے جس نے ایک زنجیر لٹکا رکھی تھی جسے ہلانے پر ٹن ٹن کی آواز وسیع و عریض محل میں گونجنے لگتی تھی اور آج اُس کے مقبرے میں بھینسیں گھاس چرتی ہیں۔ صدیوں سے زمانے کا ہیر پھیر دیکھنے والے اس شہر کے ٹھیک درمیان میں خاندانِ غلاماں کا تاجدار سو رہا ہے اور اس کی قبر سے چند فٹ کے فاصلے پر گندی نالی بہتی ہے۔ اسی شہر میں اُس تانا شاہ کا آوا تازیانۂ عبرت ہے جس نے نوکر شاہی اور سپاہ پر اِتنا پیسہ لُٹایا کہ رعایا کے لیے کچھ نہ بچا اور وہ بیرونی حملہ آوروں کا خیر مقدم کرنے لگی۔ اُس کی روایت اقتدار کے ایوانوں میں آج بھی قائم ہے۔ اُس مہاراجہ کی آخری نشانی بھی یہیں ہے جو اسی دھرتی سے اُٹھا تھا مگر اس کے بیٹے گورے لے گئے تھے۔

اس شہر کے لیے سلامتی کی دعا تو بنتی ہے جسے تیمور کے بھیڑیے بھی نوچ نہ سکے لیکن شاہی خانوادے اسے یوں بھنبھوڑ رہے ہیں کہ لکڑ بگڑ بھی دیکھ کر کہیں ڈوب مریں۔ ماضی کے شاہوں کے محل اُن کی طرح مٹ چکے ہیں مگر ایک دو جو باقی ہیں وہ بھی دورِ حاضر کے شہزادوں کی خواب گاہوں کے سامنے شرمندہ ہیں۔ ہزاروں ایکڑ پر محیط ریاستیں ایسی کہ آسودۂ خاک راجے دیکھیں تو مزید نیچے دھنس جائیں اور آنکھ نہ اٹھائیں راوی کی طرح جس

کے لیے سریلے بول بولے جاتے رہے ہیں جو آج بھی اپنی بانہوں میں بے گھروں کو سمیٹے ہے گو اسے کئی بیماریاں لاحق ہو چکی ہیں اور مسیحا کوئی بھی نہیں۔

بوڑھے دریا کو چومتی ہوئی ایک شاہراہ اُس سڑک سے جا ملتی ہے جو شیر شاہ سوری کی یاد دلاتی ہے۔ اس کے جوانب کئی دیہات آباد ہیں اور اِن میں سے ایک میں خرادیا رہتا تھا۔ پہلے وہ اُس باغ کے پچھواڑے میں بستا تھا جس کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی بنیادوں میں ایک سالے کا خون شامل ہے۔ گزرتے وقت نے باغ پر ہی بُرے اثرات نہ چھوڑے بلکہ اُسے بھی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ شہر جو پہلے بارہ دروازوں میں بستا تھا اور ایک موری کا چونگا بھی اس کے پاس تھا، اب اتنا پھیل چکا ہے کہ جامد رہنے لگا ہے، سومو پہلوانوں کی طرح جن کا بڑھاپا بڑا دردناک ہوتا ہے لیکن اس کے اونچے برج سلامت رہنے کی دعائیں مانگتے رہنا چاہیے کہ تاریخ کی ایسی ایسی نشانیاں سمیٹے ہوئے ہے جو آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں مگر ہوش والوں کی اور اُن کے لیے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا جن کے ندیدے دیدے کاغذوں میں چھپے ہیں اور اس سبب وہ خود دیکھ پاتے ہیں نہ کسی کو دیکھنے دیتے ہیں۔

یہ نگر ہے اُس لال کا جو ماں کے حضور دُکھڑے سناتا رہا اور یہ گھر ہے اُس صوفی کا جس کی ٹیڑھی اینٹ پر سنہری گوردوارہ قائم ہے گو اسے ایک دو بار خون سے غسل بھی دیا گیا۔ شمال سے آئے بزرگ بھی یہاں آرام فرما ہیں اور یہ گھر ہے اُن فنکاروں کا۔۔۔ جو سرگم چھیڑتے تھے اور برکھا برستی تھی۔ ملہار گاتے تھے، پون چلتی تھی۔ یہ کینوس ہے اُن کا۔۔۔ جن کے رنگ باتیں کرتے ہیں۔ یہ خواب گاہ ہے اُن شاعروں کی جو درباری تھے اور اُن کی بھی جو تخت گرانے کے ترانے گنگناتے رہے۔ یہ مسکن ہے قصہ گووں کا کہ جن کے چھیڑے قصے آج بھی سنائے جا رہے ہیں اور کل بھی کانوں پر گراں گزریں گے۔ اِنہی میں سے ایک قصہ خرادیے کا ہے جو کسی کی نظر میں خاص نہیں مگر وہ اس عظیم شہر کا باسی تھا اور باپ تھا ایک

چھوٹے سے بچے کا گولڑ کے تو پیدا ہوتے ہی جوان ہوتے ہیں اور باپ کا سینہ کشادہ کرتے ہیں جو طوفانی بارش میں بچوں کے سر پر چھتری بنا رہتا ہے۔

وہ سارا دن لوہے کو گھساتا رہتا تھا مگر نہیں جانتا تھا کہ خود بھی گھس رہا ہے۔ اُس کا لختِ جگر صرف ڈیڑھ سال کا تھا اور وہ ہر رات سونے سے پہلے اور جاگنے کے بعد اُس سے ڈھیروں باتیں کرتا تھا۔ اُسے پہلا کلمہ سکھانے کی کوشش کرتا۔ اللہ ہو کا ورد بتاتا۔ اُسے بغلوں سے اُٹھاتا اور اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے لا الہ کرتا رہتا تھا۔ ایک رات یونہی اُس نے بچے کو اٹھایا اور فوراً واپس لٹا دیا۔ بیوی سے پوچھا کہ یہ تپ کیوں رہا ہے؟ ماں نے بتایا کہ خالی تاپ نہیں، دست بھی لگے ہیں۔ خرادیے نے اندازہ لگایا کہ ٹھنڈ لگی ہے۔ اُس نے بچے کو کمبل میں لپیٹا اور گاؤں کے اکلوتے ڈاکٹر کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ ڈاکٹر نے ٹیکا لگایا اور دوا دیتے ہوئے تسلی دی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بچوں کے ساتھ موسم بدلنے پر چھوٹے چھوٹے مسئلے ہو جاتے ہیں۔

بچے نے ساری رات رو رو کر اور خرادیے نے اپنی بیوی کے ساتھ اُسے چپ کرانے میں گزار دی۔ سویرا ہوتے ہی بچے کی چیخیں تھمنے لگیں جیسے رات بھر کی مشقت سے تھک گیا ہو اور مزید چلانے کی سکت نہ رہی ہو۔ بغل والے کمرے سے خرادیے کا بڑا بھائی آنکھیں ملتے ہوئے آیا اور کھردری آواز میں پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تیری بھابھی بتا رہی تھی کہ کاکا ساری رات روتا رہا ہے۔ خرادیے نے بخار کے متعلق بتایا تو اُس نے اپنی دانست کے مطابق کچھ مشورے دیے اور دہی کے ساتھ روٹی کھا کر کام کو چل دیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے خرادیا بھی چائے کے ساتھ روٹی نگل کر دُکان پر پہنچ گیا اور گھسانے لگا۔ گھر میں بیوی بھی گھس رہی تھی۔ وہ ننھے کے پوتڑے دھو کر واپس آتی تو ایک اور لنگوٹ لبھڑ چکا ہوتا۔ ناک پونچھ پونچھ کر اُس کا دوپٹہ الگ سے چپ چپا ہو گیا۔ جیٹھانی اپنے بچوں کے کام نمٹاتے ہوئے اُس کا ہاتھ بھی بٹاتی جاتی تھی لیکن اُس کے اپنے جھمیلے اتنے تھے کہ بس آسرا ہی ہوتا جو

کم ہوتے ہوئے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

موسم سرما میں اس چھوٹے سے گاؤں میں سردی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے کہ چاروں طرف سے ٹھنڈی ہوائیں بغیر کسی رکاوٹ کے چلتی رہتی ہیں۔ گاڑیوں کی حرارت اور شور نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ صبح سورج دیر سے آتا ہے اور شام کو جلدی چلا جاتا ہے۔ کئی دن ایسے بھی ہوتے ہیں کہ دھند لکے کی اوٹ میں کہیں چھپا رہتا ہے۔ بڑے بوڑھے کھیتوں کے کنارے بیٹھے حسبِ عادت ماتھے پر ہاتھوں کی چھتری تان کر توانائی کا گولا دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور کھلے میں پانی کاٹنے کو آتا ہے مگر خرادیے کی بیوی کے ہاتھ سوکھنے میں نہیں آرہے تھے جو صبح سے شام تک راضی بہ رضا ٹھٹھرتی اور بھاگ بھاگ کر کام نمٹاتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ خرادیا دُکان سے واپس گھر آیا اور اُس کے سیاپے شروع ہو گئے۔

دوپہر کی سوئی گیس پر پکی روٹی اور شام کے وقت لکڑیوں کی آنچ پر بنائے گئے آلو مٹر کھا کر وہ ننھے کو سہلانے لگا جو وقفے وقفے سے ریں ریں کر رہا تھا۔ خرادیے نے بیوی سے دوا دارو کا پوچھا جس نے بروقت کھلانے پلانے کا بتایا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ چار دفعہ دوائی کھلانے کے باوجود آرام نہیں آیا، کیا بات ہے؟ اس نے ننھے کو کمبل میں لپیٹا اور ڈاکٹر کے پاس چلا گیا جس نے دوبارہ اچھی طرح معائنہ کیا۔ سکون آور ٹیکا لگا کر دوائی خرادیے کے ہاتھ میں تھما دی اور ہدایت کی کہ صبح بچے کو لازمی لے کر آئے۔

اُس رات بچہ کم کم رویا گو کبھی کبھی اُس کے گلے سے اس طرح آواز نکلتی تھی کہ معلوم نہ پڑتا سانس لینے میں مشکل پیش آرہی ہے یا رونے کی کوشش کر رہا ہے۔ خرادیا لرزتی سوچوں کے ساتھ اُسے دیکھتے دیکھتے نصف شب سے پہلے ہی نیند کی وادی میں چلا گیا اور اُس کی بیوی ساری رات میکانکی انداز میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُٹھ جاتی اور اپنے لال کو اچھی طرح دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ نیند میں بھی وہ اپنے تئیں یہی کرتی رہی اور یہ سب ایک ماں ہی کر سکتی ہے جس کی محبت کو مثال خود اُس نے بنایا ہے جس نے سارا کھیل رچایا ہے۔

سویرا ہوا تو خرادیے کی بیوی نے جاگ کر سب سے پہلے ننھے کو دیکھا، پھر برتن مانجھے اور دوبارہ بچے کو دیکھ کر کھانا بنانے لگی۔ خرادیا اُٹھا، پیٹ بھرا اور ننھے سے لاڈ کر کے کام کو نکل پڑا لیکن تین گھنٹے بعد ہی واپس آ گیا اور بچے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلا گیا جس نے معائنہ کرنے کے بعد فوری طور پر ہسپتال جانے کا مشورہ دیا۔ خرادیا بچے کو واپس گھر لایا اور تھوڑی دیر بعد میاں بیوی گھر سے نکل پڑے۔ بیس منٹ کی پیدل مسافت سے اس بڑی سڑک پر پہنچے جو شہر سے ٹریفک کا بوجھ کم کرنے کے لیے اطراف میں بنائی گئی تھی۔ اسے عبور کر کے ذیلی سڑک پر چنگ چی رکشا لیا جس نے اُنھیں تیس منٹ بعد ایک ایسی جگہ اتار دیا جہاں سے اُنھیں ایک اور رکشا لینا پڑا جو اُنھیں ہسپتال کے قریب ترین سٹاپ پر لے گیا۔ وہ دس منٹ چل کر ٹیچنگ ہسپتال کی ایمرجنسی میں پہنچ گئے جہاں سے اُنھیں بچوں کی ڈاکٹر کے کمرے میں بھیجا گیا جس نے بچے کی ہر سانس کے ساتھ نکلتی آواز کو محسوس کیا اور آکسیجن والی ایمبولینس میں فوری طور پر پرانے شہر کے بارہ دروازوں میں سے مٹ چکے ایک کی بغل میں موجود بہت بڑے ہسپتال جانے کی ہدایت کی۔ خرادیے نے منت کی کہ بوتل نہیں تو ٹیکا ہی لگا دیں تاکہ بچہ تھوڑا سنبھل جائے، پھر وہاں لے جائیں گے۔ ڈاکٹر نے پوچھا کہ کیا ایمرجنسی والوں نے کوئی دوا نہیں دی؟ جواب نفی میں ملنے پر اُس نے استقبالیہ سے ملی پرچی پر نرسوں کے لیے کیڑے مکوڑے بنا کر اُسے بچوں کے لیے ایمرجنسی ٹریٹمنٹ روم میں بھیج دیا۔

وارڈ کے باہر خرادیا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اندر ماں بچے کو گود میں اٹھائے ایسے بنچ پر بیٹھی تھی جو سردیوں میں کچھ زیادہ ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ غذا کی کمی سے پڑی چھائیوں اور راستے کی دھول سے اَٹے چہرے پر ایک رنگ آتا تو دوسرا جاتا۔ پریشانی اس بات کی زیادہ تھی کہ اُسے سامنے موجود چیزیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔ نرسوں نے بچے کو آکسیجن کا ماسک لگا دیا تھا۔ ننھی جان کی شریان ڈھونڈنے میں دقت پیش آئی۔ سوئی بار بار چبھنے سے بچہ رویا بھی بہت مگر تیسری نرس کی کوشش کامیاب ہوئی اور سوئی شریان میں چلی

گئی۔ بوتل سے قطرہ قطرہ بچے کے جسم میں منتقل ہونے لگا۔ نرسوں نے بوتل میں کچھ اور ٹیکے بھی وقفے وقفے سے داخل کیے مگر بچہ روتا رہا۔ ماں نے چپ کرانے کی بہتیری کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ وہ روتا رہا کہ اُس کے پاس اپنی تکلیف بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے، صرف رونا ہی تھا جس کا وہ استعمال کرتا رہا جب تک طاقت ساتھ دیتی رہی۔

بچوں کا رونا اکثریت کو ناگوار گزرتا ہے، اذیت دیتا ہے لیکن ہسپتال بھی کیا عجب جگہ ہے کہ بچہ روئے جا رہا تھا۔ نرسیں اپنی دھن میں کاغذات پر کچھ لکھ رہی تھیں، دوسرے بچوں کو لگی بوتلیں دیکھ رہی تھیں یا مزید ٹیکے لگانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ دور دور سے لائے گئے بچوں کی مائیں خرادیے کی بیوی کی طرف ہمدردی سے دیکھ رہی تھیں اور وہ اپنے بچے کو پریشانی سے...... اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بچے موسم بدلنے پر تھوڑا بہت بیمار ہو ہی جاتے ہیں تو میرے لال کو کیا ہو گیا ہے جو صحیح ہونے میں نہیں آ رہا۔ روئے جا رہا ہے بس روئے جا رہا ہے۔ اُسے یاد آیا کہ صبح تھوڑا سا دودھ پیا تھا جو فوراً الٹ دیا تھا۔ نرس سے دودھ پلانے کے لیے پوچھتی ہے کہ کہیں بھوک سے تو نہیں ہلکان ہو رہا؟ نرس نے بتایا کہ بوتل کے ہوتے ہوئے ضرورت نہیں۔ وہ بچے کے ماتھے پر ہاتھ پھیر پھیر کر زیر لب اللہ اللہ کرتی رہی کہ سکون ملے۔ وارڈ کے باہر خرادیا بھی بے سکونی سے کبھی ٹیک لگاتا اور کبھی کھڑکی میں لگے شیشے سے وہاں دیکھتا جہاں سے دردناک آواز آ رہی تھی۔ وہ بھی اندازے لگا رہا تھا کہ بچے کو کیا ہو سکتا ہے؟ بیماری ایسی کیا ہو گئی کہ بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے؟

دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے مگر بچے کی حالت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی گئی۔ نرسوں کی شفٹ بدلنے کا وقت ہوا تو اُنھوں نے باری باری سب کو دیکھا اور کاغذات میں کچھ لکھا۔ نئی نرسیں آ گئیں اور وہ بھی وہی عمل دہرانے لگیں۔ جب ایک نئی نرس نے خرادیے کے بچے کو دیکھا تو اُس کے چہرے پر پریشانی کی لہریں ابھر آئیں۔ اُس نرس کے لیے بھی ایک نغمہ ہونا چاہیے جو کسی کے لال کے لیے پہلی ہوتی ہے۔ وہ وارڈ میں موجود خود سے بڑی عمر کی نرس کو

بچے کے پاس لاتی ہے اور اُسے دیکھتے ہوئے مشورہ کرتی ہیں۔ پھر نئی نرس وارڈ سے نکل کر ڈاکٹر کے کمرے میں چلی گئی جہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتی واپس آئی اور خرادیے کے بچے کے پاس جا کر ماں سے کچھ کہا جو باہر کھڑے خرادیے کو سنائی تو نہیں دیا مگر پریشانی ضرور ہوئی جو اس وقت مزید بڑھ گئی جب ڈاکٹر بھی اپنے کمرے سے نکل کر وارڈ میں آ گئی۔

ڈاکٹر چند لمحے بچے کو دیکھتی رہی اور نرس کو ایمبولینس کا بندوبست کرنے کا کہہ کر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نئی نرس نے وارڈ کے دروازے میں کھڑے کھڑے خرادیے کو ایمبولینس کے متعلق بتایا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے وارڈ بوائے کو بلایا اور اُسے ہسپتال کی ایسی ایمبولینس لانے کے لیے کہا جس میں آکسیجن کا انتظام بھی ہو۔ خرادیے کے پوچھنے پر نئی نرس نے بتایا کہ بچے کو ایک بڑے ہسپتال میں بھیج رہے ہیں جہاں ہر وقت بچہ ایمرجنسی میں ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں۔ یہاں تو تھوڑی دیر میں ڈاکٹر چلی جائے گی۔ اُس کے بعد ایمرجنسی ہونے پر کسی دوسرے وارڈ سے ڈاکٹر کو بلانا پڑتا ہے اور بچے کی حالت ٹھیک نہیں۔ اسے یہاں رکھنا بہتر نہیں۔ خرادیے کو سمجھ نہیں آیا کہ اس ٹیچنگ ہسپتال میں کیا خرابی ہے جو بہت بڑا ہے اور جہاں لوگ دوسرے شہروں سے بھی آتے ہیں لیکن نرس کے چہرے کے تاثرات اسے اندر ہی اندر اعتماد دلا رہے تھے کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہاں شام کو واقعی ڈاکٹر نہیں بیٹھتا ہوگا۔

وارڈ بوائے نے واپس آ کر بتایا کہ سرکاری ایمبولینس کا انتظام نہیں ہو سکا، پرائیویٹ آ رہی ہے۔ اُس نرس نے ڈانٹا کہ جاؤ کسی ڈرائیور کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ اور خرادیے کو لے کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے پاس چلی گئی جس نے کہا کہ ہسپتال کی نہیں مل رہی تو پرائیویٹ میں لے جائیں۔ پیسے نہیں دے سکتے تو رکشا کر لیں یا یہیں مرنے کا انتظار کرتے رہیں۔ خرادیا چپ چاپ اُس کمرے سے باہر نکل آیا لیکن پیچھے دروازہ اس طرح بند کیا جیسے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مارا ہو۔ اُس نے وارڈ میں آ کر اُس نرس کی واپسی کا انتظار کیا جو

ابھی کسی غیر کے لیے پریشان ہونے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ جب وہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے سے لوٹی تو اُس نے آتے ہی ریفرنس فائل بنانا شروع کردی۔ خرادیا اسے فائل پر کرتے اور اس کی بیوی اپنے بچے کو دیکھتی رہی۔ اسی اثناء میں وارڈ بوائے آگیا کہ پرائیویٹ ایمبولینس ہسپتال کے دروازے پر کھڑی ہے۔

دوپہر کا وقت تھا اور سڑکوں پر کچھ بھی سننے اور سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ کاریں، ویگنیں، گدھا گاڑی، گھوڑا گاڑی، موٹر سائیکل، بائیسیکل سب موجود تھیں لیکن پیدل چلنا تک دوبھر تھا۔ دو پہیوں والے سوار کسی نہ کسی طرح راستہ بناتے جارہے تھے مگر چار پہیوں والے پھنسے ہوئے تھے جن میں تین سو روپے کرایہ پر لی گئی ایمبولینس بھی شامل تھی جس کا ڈرائیور مسلسل سائرن بجارہا تھا جو خرادیے کی کنپٹیوں پر تو ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا مگر بیوی اور بچے پر لگتی ضربوں کی شدت کا صحیح اندازہ نہیں۔ ٹریفک پولیس کے دو اہلکار چوک میں کھڑے آپس میں گفتگو میں مصروف تھے اور ایک جوان ہاتھ ہلا ہلا کر بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ خرادیا شیشے سے باہر تک رہا تھا اور اُس کے دماغ میں اک طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس کی بیوی حواس باختہ معلوم دے رہی تھی جسے سب دیکھنے کے باوجود کچھ نظر نہ آرہا ہو۔ وہ یوں سوچوں میں گھری تھی کہ کچھ سوچ نہ پارہی تھی۔ اُس کے اندر باہر سب سُن سا تھا جیسے سڑک پر ٹریفک جام۔ ایمبولینس پاں پاں کررہی تھی مگر کسی کو سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس کی بیوی یعنی بچے کی ماں کا بھی یہی حال تھا جو سڑک پر تھا کہ ایک کے سوا ساری پریشانیاں اپنی اہمیت کھو چکی تھیں۔

ایمبولینس نے ایک گھنٹے میں تیرہ کلومیٹر کا فاصلہ کسی نہ کسی طرح طے کرلیا اور شہر کے سب سے بڑے ہسپتال سے صرف آدھا کلومیٹر دور تھی۔ ڈرائیور خرادیے کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ سائرن بجائے جارہا تھا اور جیسے چوہا کونے کھدرے ڈھونڈتا ہے، وہ بھی راستہ تلاش کررہا تھا۔ کبھی کسی کو بچاتے اور کبھی کسی سے بچتے ہوئے بیس منٹ کے بعد اسے

ہسپتال پہنچنے میں کامیابی مل گئی۔ اس دوران میں خرادیے اوراس کی بیوی نے اتنے جھٹکے کھا لیے کہ بچہ ایمرجنسی کے سامنے جیسے ہی ایمبولینس رکی وہ یوں نکلے کہ مشکل سے توازن قائم رکھ سکے۔ ڈرائیور آکسیجن والا سلنڈر سنبھالے ان کے پیچھے پیچھے اندر گیا۔ استقبالیہ پر پہلے ہی چار لوگ پرچی بنوانے کے لیے کھڑے تھے۔ خرادیا بار بار اپنے بچے کا نام دہراتا مگر استقبالیہ پر موجود شخص پہلی پرچی پر مصروف تھا۔ ڈرائیور کو واپس جانے کی جلدی تھی، اُس نے آگے بڑھ کر کہا کہ بچہ ایمرجنسی میں ہے اور آکسیجن کا سلنڈر لگا ہوا ہے۔ استقبالیہ والے نے اس کی طرف دیکھے بغیر بچہ وارڈ میں پہنچانے کا کہا اور اپنا کام جاری رکھا۔ خرادیے کی بیوی اور ڈرائیور بچے کو ایمرجنسی میں لے گئے جہاں نرسوں نے اسے بیڈ پر لٹا کر آکسیجن لگائی اور اتنی دیر میں خرادیا بھی پرچی بنوا کر آ گیا۔

پینتیس چھتیس سال کے ڈاکٹر نے، جس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور رنگ صاف تھا، خرادیے سے پرچی اور ٹیچنگ ہسپتال کی ریفرنس فائل لے کر ایک نظر دیکھی۔ پھر دوسرے جوان ڈاکٹروں اور نرسوں کو ہدایات دینا شروع کر دیں۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے بچے سے چمٹ گئے۔ کوئی کچھ چیک کر رہا تھا تو کوئی کچھ دیکھ رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے کہا کہ بخار بہت زیادہ ہے۔ دوسرے نے بتایا کہ دل کی دھڑکن سست روی کا شکار ہے۔ تیسری نے لنگوٹ بدلنے کا اشارہ کیا۔ داڑھی والا ڈاکٹر باقی جوانوں سے زیادہ تجربہ کار معلوم دے رہا تھا، اُس نے ساتھیوں سے فارغ ہو کر خرادیے کی طرف منہ کیا اور پوچھا کہ کیا وہ اس کا باپ ہے؟ خرادیے نے ہاں میں سر ہلایا تو اُس نے بچے کو راستے میں جھٹکے لگنے کے متعلق پوچھا جس پر خرادیا سڑکیں ٹوٹی پھوٹی ہونے اور ایمبولینس کی پریشر بریک سے لگنے والے جھٹکوں کے متعلق بتاتا رہا۔ ڈاکٹر اُس کے جواب پر جھنجھلا گیا مگر اس کا حلیہ دیکھتے ہوئے چپ رہا اور خرادیے کی بیوی یعنی بچے کی ماں ۔۔۔ ماں جو اپنے بچوں کے لیے کبھی تھکتی ہے نہ ہار مانتی ہے، اُسے بچے کو ٹھنڈی پٹیاں کرنے کی ہدایت کی۔ خرادیا بھاگ کر باہر

گیا۔ ستر روپے کی پانی والی بوتل لایا اور اپنے کندھے پر رکھا پرنا اچھی طرح جھاڑنے کے بعد تر کر کے بیوی کو بوتل سمیت پکڑا دیا۔

بچے کے دونوں ہاتھوں کی اُلٹی جانب بٹر فلائیاں لگ چکی تھیں۔ ایک کے ذریعے ڈرپ لگائی گئی اور دوسری سے باری باری چار سرنجوں میں خون نکالا گیا جو خرادیے کو چار پرچیوں کے ساتھ تھما دی گئیں۔ وہ لیبارٹری ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک تہہ خانے میں پہنچا جہاں اُس سے دو پرچیاں اور دو سرنجیں لے لی گئیں اور ایک گھنٹے بعد آنے کا حکم ملا۔ اُس نے دوسری دو پرچیوں کے متعلق پوچھا تو پتا چلا کہ وہ مردانہ ایمرجنسی کی لیبارٹری میں لے کر جانی ہیں۔ وہاں اُس سے ایک پرچی اور سرنج لی گئی اور پانچ منٹ کھڑا رکھنے کے بعد اسے نتیجہ کے ساتھ لوٹا دی گئی۔ آخری پرچی اسی عمارت میں تیسری منزل پر موجود لیبارٹری میں پہنچی اور آدھے گھنٹے کے بعد آنے کا کہا گیا۔

خرادیا ایمرجنسی میں واپس آیا تو دیکھا کہ ایک نرس بوتل سے پانی اپنی ہتھیلی میں انڈیل کر اُس کے بچے کی چھاتی بھگو رہی ہے۔ سانس کے لیے آکسیجن ماسک لگایا جا چکا تھا جو ایک سیلیکون کی چوڑے پیٹ والی بوتل سے منسلک تھا اور اس کی بیوی ایمبو بیگ کو مخصوص ردھم کے ساتھ ہاتھوں سے دبا رہی تھی۔ اس نے ایمبو بیگ کو ہاتھوں سے گیند کی طرح پکڑا ہوا تھا، دبانے پر ہوا اندر جاتی اور انگوٹھے ڈھیلے چھوڑنے پر باہر آتی تھی۔ خرادیا حیرانی سے سارا عمل دیکھتا رہا جب تک ڈاکٹر نے اس سے پوچھا کہ بچہ کب سے بیمار ہے؟ خرادیے نے اُسے گاؤں کے ڈاکٹر سے لے کر ٹیچنگ ہسپتال اور یہاں تک پہنچنے کی روداد سنا دی لیکن یہ نہ بتایا کہ کتنے دن سے بیماری گھر بنائے بیٹھی تھی۔ اسے علم ہی نہ تھا کہ سردی لگ جانا بھی بیماری ہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نے ڈانٹا کہ اسے پتا نہیں اُس کا بیٹا ایک سو چھ بخار میں تڑپ رہا ہے اور وہ دیوار پر نصب کی گئی مشین کو قریب ہو کر غور سے دیکھنے لگا جو بچے کے دل کی دھڑکن کا گراف بنا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے چند لمحے بعد خرادیے کی طرف مڑتے ہوئے ایک سادہ کاغذ

پر کچھ لکھ کر اسے پکڑایا اور کہا کہ ایکسرے روم جا کر دکھائے، کہے کہ ایمرجنسی ہے، کب تک بچہ لے آئیں؟

خرادیے نے ہدایت پر عمل کیا مگر ایکسرے روم میں شفٹ تبدیل ہو رہی تھی اور مشین کو آرام دیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے غصے سے کہا کہ ٹیکنیشن کو جا کر کہو مشین سٹارٹ کرے۔ خرادیے نے ایسے ہی کہا تو ٹیکنیشن نے مسکراتے ہوئے وہی کہا جو پہلے کہہ چکا تھا کہ بیس منٹ سے پہلے مشین سٹارٹ نہیں کروں گا۔ ڈاکٹر نے خرادیے کی زبانی مشین ریسٹ کا سن کر وارڈ بوائے کو بھیجا جو واپسی پر ویسا ہی پیغام لایا۔ تب ڈاکٹر نے غصے کے ساتھ اپنے ساتھی سے کہا کہ اس کی تحریری شکایت کروں گا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ مشین ریسٹ پر ہے۔ یہاں بچے تڑپ رہے ہیں اور مشین ریسٹ پر ہے۔ یونہی بولتے بولتے اُس کی نظر اچانک خرادیے پر پڑی تو اس نے کچھ سوچتے ہوئے اسے ٹیسٹوں کے نتیجے لانے کے لیے بھیج دیا اور خود دوسرے بچوں کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

خرادیا بھاگا بھاگا گیا اور دو لیبارٹریوں سے دو نتیجے لے آیا۔ آخری ٹیسٹ کی رپورٹ دو دن بعد آنے کی خبر بھی لایا۔ اُس کی غیر موجودگی میں ایکسرے ہو چکے تھے۔ اس کی بیوی اب تک بیڈ کے ساتھ کھڑی ایمبو بیگ کے ذریعے اپنے بچے کو سانس فراہم کر رہی تھی اور اُس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ زرد لگ رہا تھا مگر خرادیے کا دھیان اُس کے چہرے پر کہاں تھا، وہ تو بچے کو دیکھ رہا تھا جو اب خاموش اور بے سدھ نظر آ رہا تھا۔ خرادیے نے خدشات کو دماغ سے جھٹکا اور ارد گرد دیکھنے لگا۔

میاں بیوی چپ چاپ کھڑے تھے جبکہ وارڈ میں ایک عجب شور تھا جو ان کی سماعت سے پرے تھا۔ ماؤں اور باپوں کی خاموش چیخیں کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ اس آہ و پکار میں ایک آواز اس خاتون کی بھی شامل تھی جو اُس شہر سے آئی تھی جس میں لکھوکھا لوگ رہتے تھے۔ لوگ اچھے لوگ، برے لوگ، غریب لوگ، امیر لوگ، ہر مرئی اور غیر مرئی شے پر ٹیکس دینے والے، زبردستی لینے والے، واپس کچھ نہ دینے والے، ذلیل اور کمینے لوگ، غلام

معاشرے کے بے حد آزاد لوگ، ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لوگ جو ٹھپے سے لاعلم ہیں اور باخبر بھی۔۔۔ وہ بھی ان میں شامل تھی جنہیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔۔۔ پھر بھی وہ آئی تھی جرنیلی سڑک پر سینکڑوں کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اپنے بچے کی جان بچانے جسے سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ اُس سینکڑوں کلومیٹر کی مسافت میں کروڑوں لوگ بستے ہیں، وہی لوگ جن کی بابت ابھی کچھ کہا ہے، جن کا ذکر کرتے ہوئے آنکھ بھر آتی ہے، جن کے بیان سے انگاروں پر لوٹنا پڑتا ہے اور جن کی گفتگو سے خون کھول اٹھتا ہے لیکن وہ اس سب سے بے پروا تھی مگر اُس کی آنکھوں میں بے بسی چیخ رہی تھی جو کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سنی جاتی تو سینکڑوں کلومیٹر پر محیط لمبی راہ اور انتظار کا اوکھا پینڈا طے نہ کرنا پڑتا۔

اس وارڈ میں ایک اور بچہ چت لٹایا گیا تھا۔ اسے بھی خرادیے کے بچے سے ملتی جلتی کوئی بیماری تھی شاید۔۔۔ کہ خرادیے کی بیوی اس کے گلے سے اٹکتی، نکلتی مانوس آواز پر بار بار اُسے دیکھتی تھی۔ اُس کی ماں بنچ پر بیٹھی تھی اور کچھ اس طرح بیٹھی تھی کہ آدھی لیٹی دکھائی دیتی تھی اور اُس کا باپ وارڈ سے باہر دیوار کے ساتھ سفری سامان کو سرہانا بنائے فرش پر پڑا قرض کا حساب کر رہا تھا جو زندگی نے اس پر بے طرح چڑھا رکھا تھا۔ اُس کے قریب پڑے پتھریلے بنچ ان لوگوں نے مل رکھے تھے جن کی قیود پہلے سے متعین کر دی جاتی ہیں۔ وہ بچہ وہاں سے آیا تھا جہاں سے دوسرے صوبے کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ حدیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ زیادہ کانٹے کی طرح کھٹکتی ہیں اور کم دیوار چین کی مانند محفوظ رکھتی ہیں مگر اس نگر میں رائج حدود کا کیا مذکور ہو کہ جس میں ہر اس آدمی پر حد لگ جاتی ہے جو کسی دوسرے کو حدود و قیود میں نہ لا سکتا ہو اور خرادیا بھی انہی میں شامل ہے جن کی حد بندی کی جاتی ہے۔ ہر سانس پر حد، ہر آس پر حد، دائیں حد، بائیں حد، آگے حد، پیچھے حد، اوپر حد، نیچے حد، حق مانگنے پر حد، حق چھیننے پر حد۔۔۔ دم گھٹ کیوں نہ جائے؟ چلتا رہے تو حد۔۔۔ اور تم اپنی کون کونسی ذمہ داری سے جان چھڑاؤ گے۔

خرادیے کا بچہ چار گھنٹے اس بیڈ پر رہا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا ڈاکٹر پوری تندہی سے

علاج کرتا رہا۔ جب وہ ایمر جنسی میں آنے والے دوسرے بچوں کو دیکھنے جاتا تو خرادیے کے بیٹے کے پاس دو ڈاکٹر چھوڑ جاتا۔ نرسیں بھی نرم روی سے پیش آتی تھیں۔ پھر بھی کچھ ٹھیک معلوم نہیں دے رہا تھا، خرادیے کو نہ ڈاکٹر کو۔۔۔ اور ماں تو پہلے ہی خطرہ بھانپ لیتی ہے۔ ڈاکٹر دوسرے بچوں سے فارغ ہو کر آتا تو بار بار اپنی داڑھی کھجلاتا تھا جس پر خرادیا اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگتا مگر اُسے ایک اطمینان تھا کہ ڈاکٹر کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں اور اس کے بچے کو نظر انداز نہیں کیا جا رہا کہ اس نے سرکار کے ہسپتالوں میں بے حسی اور سفاکی کے کئی قصے سن رکھے تھے۔ تبھی اسے ڈپٹی سپر نٹنڈنٹ یاد آیا جو اس کے بچے کے جینے یا مرنے سے قطعی لاپرواتھا اور ایک ادھیڑ عمر نرس کی سرگوشی بھی دماغ میں گھسی جسے ننھی جان سے زیادہ اپنے ریکارڈ کی فکر تھی لیکن اس بڑے ہسپتال کے ڈاکٹروں کے متعلق اس کا خیال بدل چکا تھا۔ وہ کچھ کرنے کے خواہشمند تھے مگر ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ان کی مثال اس مکینک کی ہے جسے ورکشاپ کا مالک پورے اوزار دیے بغیر گاڑی کے نیچے گھسا دیتا ہے۔ یہی بات اس کے لیے پریشان کن تھی کہ اتنا بڑا ہسپتال جس میں پیدل چلتے چلتے آدمی تھک جائے اور پورا پھر بھی دیکھا نہ جائے، اس کے لیے خالی کیوں ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہے کہ سوئی گیس کا بل آتا ہو مگر جلانی لکڑیاں پڑتی ہوں یا شیشے کی طرح لشکارے مارتی سڑک ہو لیکن اس پر چلنے والا کوئی نہ ہو جیسے بڑی سی کوٹھی کے کسی کونے میں نادار بوڑھا اکیلا پڑا رہے۔

چار بجے کے قریب داڑھی والے ڈاکٹر کے جانے کا وقت ہوا تو اُس نے ایک ساتھی کو کہا کہ خرادیے کے بچے کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں منتقل کرنے کی تیاری کرے۔ دوسرے کو کاغذی کارروائی کرنے کی ہدایت کی اور خود بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ ایک متمول نظر آنے والے ڈاکٹر نے آئی سی یو میں منتقلی کی فائل تیار کر کے اس ساتھی کو پکڑائی جس کا حلیہ پسماندہ پس منظر کی چغلی کھا رہا تھا۔ اُس نے ڈرپ کا سامان احتیاط سے اٹھایا اور بچہ اٹھائے سیڑھیاں چڑھنے والے خرادیے کے ساتھ ساتھ قدم بڑھانے لگا تا کہ سوئی ہل نہ جائے۔ ماں نے ایمبو بیگ اٹھا رکھا تھا اور قدم بڑھاتی، دباتی جا رہی تھی۔ وہ پہلی منزل پر

پہنچے تو خرادیا ذرا رکا مگر ڈاکٹر نے سیڑھیاں چڑھنے کا اشارہ کیا۔ دوسری پر گئے تو پھر اسے یوں لگا کہ یہی رکنا ہے مگر تیسری کی طرف قدم بڑھانے پڑے اور تیز تیز سانس لیتے ہوئے وہ بالآخر چوتھی منزل پر پہنچ گئے جہاں انتہائی نگہداشت وارڈ تھا۔ تین نرسیں ان کی طرف لپکیں، بچے کو بیڈ پر لٹایا۔ گلوکوز والی بوتل کو احتیاط سے لٹکایا۔ ماں کو ایمبو بیگ استعمال کرنے کا صحیح طریقہ بتایا۔ دو نرسیں واپس اپنی کرسیوں پر جا بیٹھیں جبکہ تیسری باہر چلی گئی اور ایک دو منٹ میں ڈاکٹر کے ساتھ واپس آ گئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے آتے ہی فائل پڑھی، بچے کا اچھی طرح معائنہ کر کے نرسوں کو ہدایات جاری کیں اور دوبارہ اپنے کمرے کو ہولی۔

بچوں کے لیے مخصوص انتہائی نگہداشت وارڈ میں چھ بیڈ اور تین وینٹی لیٹر تھے۔ دو پہلے سے موجود بچوں کی سانسیں جاری رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور تیسرا خرادیے کے بیٹے کے قریب بند پڑا تھا۔ ماں جو صبح سے کھڑی ایمبو بیگ کے ذریعے ننھے کے پھیپھڑوں تک ہوا پہنچا رہی تھی، اب بیڈ کے قریب رکھے بنچ پر بیٹھی وہی کام کرنے لگی لیکن وہ پریشان تھی کہ کئی گھنٹے سے بچہ رویا نہیں اور آنکھوں کی رنگت بھی بدلی بدلی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کا اپنا رنگ بھی اڑا ہوا تھا اور وہ سہمی سہمی سی وارڈ میں نظریں گھما رہی تھی۔ کبھی بچوں کو دیکھ رہی تھی اور کبھی اُن کی ماؤں کو جن کے چہروں پر ایک ہی چیز دکھائی دے رہی تھی جو اس کے منہ پر بھی تھی کیونکہ وہ ماں تھی جو عجیب مخلوق ہے کہ روح ہے جو تمام بدروحوں کے سامنے ڈٹ جاتی ہے بالکل اس کی طرح۔۔۔ جس کا ناشتہ بھی ادھورا تھا اور پیاس سے حلق سوکھا ہوا تھا مگر وہ بھوک اور تکان سے لاعلم دکھائی دے رہی تھی۔ وہ نیند کے غلبے سے بھی ایسے ہی بے خبر تھی جیسے درد سے چیخ رہے جوڑ جوڑ سے کہ اس کا سارا دھیان ایمبو بیگ کو صحیح طرح دبانے پر لگا ہوا تھا کیونکہ ڈاکٹروں نے اسے تھماتے ہوئے بتایا تھا کہ تمہارے بچے کی جان اب تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ ہاتھ ہلتے رہیں گے، سانس چلتی رہے گی۔

خرادیے نے ڈاکٹر کو دو مرتبہ بتایا کہ صبح سے کھڑی ایمبو بیگ استعمال کر رہی ہے۔ تھک گئی ہے۔ وینٹی لیٹر چلا دیں مگر ڈاکٹر کے بس میں کہاں تھا کہ خراب وینٹی لیٹر کام کرنے

لگے گو اس نے معلوم ہونے کے باوجود خرادیے کے اصرار پر اپنی سی کوشش کی اور اُنھیں ہوا والی تھیلی دباتے رہنے کی تاکید کر کے باہر نکلی اور پانچویں منزل پر جانے کیا کرنے چلی گئی۔ وہ ایمر جنسی وارڈ میں گیا اور ڈاکٹر کو وینٹی لیٹر کا ماجرا سنایا کہ بچے کو کسی اور وارڈ میں منتقل کر دیں۔ڈاکٹر نے پریشانی سے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور اسے سمجھایا کہ ایک ہی آئی سی یو ہے جس میں صرف تین وینٹی لیٹر ہیں اور کہیں نہیں ہیں۔خرادیے نے شاید سنا نہیں تھا تو ڈاکٹر نے مزید واضح کیا کہ اگر وہ بچے کو پرائیویٹ ہسپتال لے جانا چاہتا ہے تو بتا دے یا بچوں کے لیے مخصوص سرکاری ہسپتال جانا ہے تو بھی کہہ دے مگر بچوں کے ہسپتال میں رش زیادہ ہوگا اور پتا نہیں کہ وینٹی لیٹر وہاں بھی ملے گا یا نہیں۔ڈاکٹر نے فیصلہ اس پر چھوڑا اور خود ایک بچے کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ کچھ دیر وہیں ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر سیڑھیاں چڑھ کر چوتھی منزل پر موجود انتہائی نگہداشت وارڈ میں آ گیا اور بیوی کو آرام دلانے کے لیے سانس رساں تھیلی دبانے کی کوشش کی مگر اس سے صحیح طرح دبایا نہ جاتا تھا اگر چہ وہ کوشش کرتا رہا تا آنکہ ایک نرس نے اسے ہٹا دیا اور ایمبو بیگ اس کی بیوی کو تھما دیا۔

خرادیا---ایک باپ بھی کم عجیب نہیں کہ صبح سے اندر باہر، اوپر نیچے آجا کر اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا مگر وہ وارڈ کے باہر یوں کھڑا ہو گیا جیسے موت کے سامنے ڈھال بنا ہو لیکن کوئی اسے کہاں روک سکتا ہے بھلا۔ وارڈ کے باہر کھڑے خرادیے کے ہونٹ دعا کے لیے اور اندر موجود ماں کے ہاتھ سانس کے لیے ہلتے رہے مگر اُنھیں خبر ہی نہ ہوئی کہ کب اندھیرا چھا گیا۔ ماں بھی زندگی کی روشنی بچا نہ سکی۔اسے اتنا ہوش بھی نہ تھا کہ خود کو یا کسی اور کو قصور وار ٹھیراتی اور خرادیے کو جیسے چُپ لگ گئی - چنگھاڑتی ہوئی چپ --- دھاڑتی ہوئی چُپ ---خوف میں ڈوبی چُپ --- مصلحت جان کر اپنائی چُپ --- سیانی چپ --- ہونق چُپ --- ہر طرف چُپ ہی چپ اور اس پر خرادیے کی کان پھاڑتی ہوئی، پکارتی ہوئی چپ جس کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

کاغذی کارروائی پوری ہونے تک وہ قدرے سنبھل چکے تھے۔ ماں خود کو قصور وار

ماننے لگی تھی کہ اُس نے سانس رساں تھیلی صحیح طرح نہیں دبائی۔ خرادیا خود کو کوس رہا تھا کہ پرائیویٹ ہسپتال لے جاتا تو وینٹی لیٹر ملتا اور وہ شاید بچ جاتا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے ڈیتھ سرٹیفکیٹ پکڑایا تو خرادیے کے منہ سے بلا سوچے سمجھے نکل گیا کہ وینٹی لیٹر نہ ہونے سے میرا بچہ مر گیا۔ ڈاکٹر کبھی خرادیے اور کبھی اس کی بیوی کو دیکھتی اور بالآخر اس نے بتایا کہ کہ بچے کا دم نہیں گھٹا، دل ڈوب گیا تھا لیکن خرادیے اور اس کی بیوی کو کچھ سمجھ نہ آیا اور اُنھوں نے وینٹی لیٹر کو عجیب نظروں سے دیکھا جیسے اس نے ایک باپ اور ایک ماں کو شکست دے دی ہو۔ دوسرے وینٹی لیٹر پر موجود بچوں کی مائیں ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں اور ایک کی آنکھوں سے آنسو بھی نکل رہے تھے۔ نرسوں کے چہرے پر افسردگی طاری تھی اور ڈاکٹر بے بسی کا اظہار کر کے اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

جب وہ آرزوؤں اور حسرتوں کی لاش اٹھائے ہسپتال سے نکلے تو تاریخ کے ماتھے پر نگینے کی طرح جڑا شہر تاریکی میں بھی جگمگا رہا تھا اور ان کی منزل دور اندھیرے میں ڈوبا ایک کونہ تھا۔ خرادیے نے آٹو رکشا روکا جس کے ڈرائیور نے پانچ سو روپے کرایہ مانگا اور وہ بھاؤ تاؤ کے بغیر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی بھی خلافِ عادت کچھ نہ بولی، رکشے میں بیٹھی اور آنکھیں بند کر لیں اور کسیلا پانی کمبل میں لپٹے بے جان وجود پر قطرہ قطرہ گرنے لگا۔ خرادیا کبھی اسے دیکھتا اور کبھی رکشا کے ٹوٹے دروازے سے باہر گھورتا جہاں برقی قمقمے دودھیا روشنی پھینک رہے تھے مگر جس اندھیرے نے اُنھیں ہسپتال میں لپیٹا تھا، وہ کم نہیں ہوا تھا، مسلسل پھیل رہا تھا اور اس پورے شہر کو نگل رہا تھا جو رام کے بیٹے سے منسوب ہے، جو رات اور دن کے پھیر سے نکل کر ہمیشہ سانس لیتا رہا جسے کبھی وینٹی لیٹر کی ضرورت نہیں پڑی مگر بے جان وجود پر جھکتے خرادیے کو سانسیں بے ترتیب محسوس ہو رہی تھیں۔

پندرہ جنوری دو ہزار سولہ عیسوی

غیر دلچسپ کہانی

وحید میرا اچھی رساں تھا، وحید سے پہلے ریاض اور ریاض سے پہلے مرزا نوید بیگ تھا۔ مرزا نوید بادشاہ آدمی تھا۔ اُس کا ایک قصہ مَیں سبھی کو سنا چکا ہوں اور وہ ہے بھی بہت دلچسپ کہ جو سنتا ہے، ہنستا ہے، میں سر پیٹتا ہوں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ایم اے کیے تین سال ہو چکے تھے۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ مَیں نے ایم اے کیا تھا بھی اور وہ بھی اردو میں، پرائیویٹ۔ اردو میں ایم اے کرنے والوں کی کئی کہانیاں مشہور ہیں اور ڈرامے بھی بن چکے ہیں جن میں اردو میں ایم اے کرنے والا کسی چاند چہرہ کی فتنا سی کا شکار ہو جاتا ہے اور رُسوا ہوتا ہے۔ مَیں بھی خواری کاٹ رہا تھا کہ ابا نے ایک دوست سے بات کی جس نے مجھے ایک اخبار میں لگوا دیا اور یوں میں منٹو والا صحافی بن گیا جسے مہینوں تنخواہ نہیں ملتی اور یہ ایک ایسے مہینے کی ایسی ہی رات تھی کہ میرے پاس سگریٹ خریدنے کے بھی پیسے نہیں تھے اور مَیں اپنے حصے کا کام نمٹا کر ٹی وی پر خبریں سن رہا تھا۔ ایک خبر ایسی چلی کہ شیخوپورہ میں زمیندار نے تنخواہ مانگنے پر بارہ سالہ ملازم کا ہاتھ چارہ کاٹنے والے ٹوکے سے کاٹ دیا۔ مجھ میں نہ جانے کہاں سے اتنا غصہ بھر گیا اتنا غصہ بھر گیا کہ بس ۔۔۔ اور سمجھ بھی نہیں آئی کہ کروں کیا؟ رفیقِ کار سے سگریٹ لے کر پھونکے۔ گالیاں بھی بک لیں مگر غصہ وہیں کا وہیں ۔۔۔ اُن دنوں صحافی کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ جیسی جدات سے دور تھے، قلم کاغذ استعمال کرتے تھے اور مَیں نے سارے کا سارا غصہ لفظ بہ لفظ سطر بہ سطر صفحہ بہ صفحہ نکال دیا۔

رفیق کار نے جب پڑھا تب حیرت سے بولا کہ بابو یہ تو کہانی ہوگئی۔ وہ کہانی بغل میں لیے مَیں چند ایک اساتذہ کے پاس گیا جنھوں نے اِسے اچھا کہا اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے بھی اچھی لگی اور مَیں نے جانا کہ یہی وہ کام ہے جس سے مجھے خوشی ملتی ہے اور یہی وہ کام ہے جو میں اس دنیا میں سب سے اچھا کرسکتا ہوں سو مجھے یہی کرنا چاہیے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک استاد کے مشورے پر کہانی ایک رسالے کو اپنے پتے کے ساتھ بذریعہ ڈاک ارسال کردی۔ مہینوں گزر گئے بلکہ سال ہونے کو تھا کہ کہانی کی کوئی خبر نہ ملی تو ایک روز اسی استاد سے رسالے کے مدیر کا فون نمبر لیا، گھنٹی بجائی اور یہ جان کر ہکا بکا رہ گیا کہ کہانی مہینوں پہلے چھپ چکی تھی اور رسالہ بھی چھ سات مہینے پہلے ارسال ہو چکا تھا۔

میرا ڈاک خانہ وہی ہے جہاں کبھی گلاب دین ہوتا تھا جس کی کہانی بڑی دلچسپ تھی اور کم دلچسپ میری بھی نہیں اگرچہ یہ بہتوں کو لگتی نہیں۔ پھر بھی کہنے میں کیا حرج ہے کہ میرے ڈاک بابو کی کہانی بھی دلچسپ ہے، راجہ بھوج کی سنی جاتی ہے تو گنگو تیلی کی بھی سن لینی چاہیے لیکن یہ مَیں پہلے بتا دوں کہ اس کہانی میں نرتکیوں کا ذکر نہیں اور اب وہ نرتکیاں رہیں بھی نہیں جن کی کہانی بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ وہ لاہور بھی نہیں رہا جو بہت دلچسپ ہوتا تھا جہاں زندگی کے ست رنگ کھلتے تھے۔ چوبارے تھے، حویلیاں تھیں، میلے تھے، ٹھیلے تھے، پٹھورے اور پیڑے والی لسی تھی، حلوہ پوری، سری پائے اور بونگ اور نہاری اور کلیجے بڑے بڑے۔ اب کلیجے بھی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور کھانے والے بھی۔۔۔

یہیں ایک لوہار تھا جو ہفتے کی رات گلی میں بیٹھ کر بونگ پکاتا تھا اور سویرے سویرے گلی کے بچے پیالے بھر بھر لے جاتے تھے، اُس نے کبھی کسی سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے؟ البتہ جو پیالہ ختم نہیں کرپاتا تھا وہ لوہار سے جگتیں ضرور سنتا تھا۔ وہ پیالے نہیں رہے، کٹوریاں ہیں اب چھوٹی چھوٹی، ٹھوٹھیوں جیسی نظر آتی ہیں۔ ان دنوں کونڈے ہوتے تھے تو وہابیوں کے لڑکے بھی پڑھتے، کھاتے تھے، ختم پڑھے جاتے تھے تو ختم نہ کھانے والوں کا حصہ پڑھائی

سے پہلے نکال لیا جاتا تھا، نفرتیں کم تھیں، پیار زیادہ تھا، بس جی وہ لاہور یے نہیں رہے، وہ لوہار نہیں رہا اور وہ موچی بھی نہیں رہا جو تہواروں پر مفت جوتے مرمت کرتا تھا، گاما بھی نہیں رہا جو محلے کے بچوں کو آوارہ گردی سے بچانے کے لیے پہلوانی سکھاتا تھا، لوک دانش بھری بیٹھکیں نہیں رہیں اور وہ تھڑے بھی نہیں رہے جو لوگوں کو جوڑتے تھے، اب چلتے پھرتے گوشت پوست کے روبوٹ ہیں اور روبوٹ کیا خاک دلچسپ ہوتے ہیں۔ ایک بار پروگرام کر دیے تو اسی ڈگر پر چلتے رہے جیسے مَیں یا پھر مَیں، صبح اُٹھنا، کام پر جانا، واپس آنا، بچوں سے تھوڑا بہت پیار کرنا، بیوی کی ڈانٹ سننا اور سو جانا۔ کوئی ہلچل نہیں اور جب ہلچل نہیں تو دلچسپی کیسی؟

مَیں ڈاک خانے میں لکڑی کے بنچ پر بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ کبھی گلاب دین یہاں سے نکلتا تھا، گھر گھر جا کر چٹھیاں بانٹتا تھا، پڑھ کر سناتا تھا، پیسے پہنچاتا تھا اور وصول کرنے والے وصولی سے پہلے چائے پانی پوچھتے تھے۔ اب مرزا ہے جس کا مَیں انتظار کر رہا ہوں کہ وہ آئے، مجھے رسالے کے متعلق بتائے اور کوئی ایک گھنٹے بعد وہ آ بھی گیا۔ استفسار پر پہلے تو اُس نے میری شکل غور سے دیکھی، پھر میرے حلیے پر حیرانی واری اور اس کے بعد میری نظروں سے دور ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد خاکی لفافہ تھامے واپس آیا اور میرا بازو پکڑ کر مجھے ڈاک خانے سے باہر لے گیا، ٹھنڈے گرم کا پوچھا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بتایا کہ میرا گھر کئی بار ڈھونڈا تھا، ملا ہی نہیں۔ اچھا ہوا مَیں آ گیا ورنہ وہ رسالہ واپس بھیجنے کی سوچ رہا تھا۔ مرزا سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

پھر دھن دھن جاگے بھاگ کہ مجھے ریاض ملا۔ ڈاک کوئٹہ سے نکلتی یا کراچی سے، دو تین دن میں میرے پاس ہوتی۔ وہ ایسے رسالے بھی پہنچا جاتا جو اکثر ڈاک بابو فضول مان کر کہیں پھینک دیتے ہیں۔ میری دانست میں وجہ یہ تھی کہ ریاض نے سائیکل کے پیچھے ڈاک سے بھرا تھیلا نہیں رکھا ہوتا تھا بلکہ لکڑی کی پیٹی ہوتی تھی جس میں چھوٹی موٹی گھریلو

استعمال کی اشیاء ہوتی تھیں جو دُکان وہ بیچتا تھا اور میری گلی کے نکڑ پر موجود پرچون فروش اُس کا پکا گاہک تھا۔ یوں کم ازکم میری ڈاک میں کبھی دیری ہوئی نہ غائب ہوئی۔

ایک بار کیا ہوا کہ دو تین مہینے گزر گئے اور میری ایک ڈاک بھی نہ آئی ۔ مجھے گمان ہوا کہ ریاض نہیں رہا۔ مَیں نے گلی کے نکڑ پر موجود دُکان دار سے ریاض کا فون نمبر لیا۔ اندازہ کیجیے کہ وہ تین چار سال مجھے ڈاک پہنچاتا رہا اور میرے پاس اُس کا فون نمبر نہیں تھا۔ اب ایسے آدمی کو دلچسپ کہانی خاک ملے گی؟ ویسے یہ لفظ دلچسپ بھی کیا دلچسپ ہے کہ کس کو کس میں دلچسپی ہے اور کس میں نہیں، نرا رولا ہے مگر میرا رولا تو یہ تھا کہ ریاض تبدیل ہو گیا۔ جی ہاں، ریاض تبدیل ہو گیا جبھی ڈاک نہیں مل رہی تھی اور فون پر تصدیق بھی ہو گئی۔ ریاض نے پہلے اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا، پھر استفسار کیا کہ اتنے برسوں میں کبھی کوئی تنگی تکلیف ہوئی؟ مَیں نے کھل کر تعریف کی تو وہ بولا کہ وہ اسی علاقے میں خوش تھا، سیل مینی سے اضافی آمدنی بھی ہوتی تھی، اب دوبارہ دُکانیں پکی کرنے کے لیے محنت کر رہا ہے البتہ نوکری پر کام کم ہے اور آرام زیادہ ہے اور یہ بھی بتایا کہ اُس کے خلاف ایک سرکاری سکول کی اُستانی نے شکایت کی تھی کہ بچوں سے سٹرفکیٹ دینے کے لیے مٹھائی کے پیسے مانگتا ہے۔ اُسی نے مجھے نئے ڈاک بابو سے ہوشیار رہنے کی تنبیہ بھی کی تھی کہ کبھی اُس پر پیسوں کے حوالے سے اعتبار نہیں کرنا، وہ جہاں بھی جاتا ہے، قرض دینے والے پیچھے چھوڑ آتا ہے۔

ریاض کے دیے موبائل نمبر پر رابطہ کیا اور دو تین دن میں وحید سے ملاقات ہو گئی اور یوں رسائل کا سلسلہ بھی بحال ہو گیا لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ ہر ڈاک کے لیے اُسے بیسیوں فون کرنا پڑتے۔ کتاب بھیجنے والے کو کہنا پڑتا کہ بھیج چکو تو آگاہ ضرور کرنا تا کہ ڈاک بابو سے پوچھ تاچھ کی جا سکے۔ کبھی میں وحید کو فون کرتا، کبھی اس سے اوپر بیٹھے ایک آدمی سے کال ملاتا اور کبھی ڈاک خانے کے منتظمِ اعلیٰ سے بات کرتا لیکن ڈاک تب ملتی جب وحید کا جی چاہتا سو مَیں تھک ہار کر اُسی سے رابطہ بہتر بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس

کے پاس ہر بار ایک لا جواب کرنے والا بہانہ تیار ہوتا تھا۔

بچوں کی رول نمبر سلپس آئی ہوئی ہیں، بہت ضروری ہوتی ہیں، جلدی پہنچانا پڑتی ہیں۔

مَیں نے بتایا، بھائی میری ڈاک بھی ضروری ہوتی ہے، کسی نے رقم خرچ کر کے بھیجی ہوتی ہے، تم جو رسالے اور کتابیں پہنچاتے ہو، مَیں انہی پر کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں اور پیسے کماتا ہوں۔

''او اچھا جی۔ یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔ اب ایسا نہیں ہوگا'' یہ بات وہ ہزار بار کہہ چکا تھا اور مَیں ہر بار نہ چاہتے ہوئے بھی مان لیتا کہ واقعی ایسا نہیں ہوگا۔ پھر خود کو تسلی دیتا کہ چلو کوئی بات نہیں، دیر سے سہی، پہنچا دے گا اور وہ پہنچا بھی دیتا لیکن بے چینی کبھی بڑھ جاتی اور کبھی غصے میں بدل جاتی اور کبھی مَیں بے بسی کا کمبل اوڑھ لیتا۔ وہ دنیا میں مجھ سے بہت بہت پہلے آیا ہوگا مگر مَیں اُسے اس قدر سخت باتیں بھی کہہ جاتا کہ کوئی اور ہوتا تو فون میں سے نکل کر مجھے تھپڑ رسید کرتا لیکن اُس کی آواز میں کبھی ترشی محسوس نہ ہوئی، لجاجت ہی لجاجت ہوتی تھی۔

وہ جی آئندہ نہیں ہوگا۔ بس جی پھنسا ہوا تھا۔ رات دس بجے تک ڈاک بانٹتا رہا۔ کل آ جاؤں گا۔ کتاب تھیلے میں ڈال لی ہے۔ مَیں پرسوں کام سے واپس آؤں گا تو کتاب گھر پڑی ہوگی۔ تھوڑا صبر کرلوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، لیکن کچھ ٹھیک نہ ہوا۔

مجھے اکثر ہنسی آتی کہ یہ تو میرے صحافی ہونے کا بھی ذرا خیال نہیں کرتا۔ لیکن میرا یہ خیال خام تھا شاید۔ اُس کے دبے دبے لہجے کا سبب یہی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ کیا معلوم کہ کیوں وہ دن میں تین تین فون کرنے پر بھی جھنجھلاہٹ ظاہر نہیں کرتا تھا؟ اُس کی باتوں سے کبھی کبھی یہ معلوم ضرور پڑتا کہ وہ جانتا تھا اگر مَیں اُس کی شکایت جی پی او میں کروں تو اُسے ٹھیک ٹھاک پریشانی ہوگی۔ مجھے کئی دوستوں نے مشورہ بھی دیا مگر مَیں ہر بار ٹال جاتا کہ کوئی بات نہیں۔ سر جی سر جی کرتا ہے۔ اب میری ڈاک ایسی بھی ضروری نہیں کہ ہفتے بھر کی تاخیر سے کوئی آسماں ٹوٹ پڑے۔ آ ہی جائے گی اور آ بھی جاتی۔

جب وحید کو آتے جاتے کوئی تین مہینے ہوئے تو ایک روز اُس نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی کہ ڈاک آئی ہوئی ہے اور ایک کام بھی ہے۔ میرے ذہن میں فوراً ریاض کی تنبیہ آئی کہ بچ کے رہنا۔۔۔اور خود کو تیار کر لیا کہ اگر پیسے مانگے تو کتنے دینے ہیں اور ہوا بھی اسی طرح کہ اُس نے پانچ سو ادھار مانگا، مَیں نے دو سو میں پکا ٹرخا دیا۔ ابا کہتے تھے اُدھار مانگنے والے کو اُتنا ہی دینا چاہئے جتنا واپس نہ ملنے پر زیادہ تکلیف نہ ہو اور آدمی ملتا بھی رہے اگرچہ اُس دن کے بعد جب کبھی وہ ڈاک لے کر آیا اور میرے متعلق پوچھا تو گھر والوں نے ایک ہی جواب دیا کہ گھر پر نہیں۔

ایک دن کیا ہوا کہ میرے گھر والے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے اور مَیں دفتر جانے کی تیاری میں کھانا کھا کر چائے بنا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کواڑ کھولے تو اُسے سامنے پایا۔ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے اُس کے سیاہی مائل چہرے پر صاف صاف نظر آ رہے تھے۔ ناک بھی گیلی گیلی سی تھی جسے اُس نے میرے سامنے کف سے پونچھا اور وہی ہاتھ پھر مجھ سے ملایا، مسکرایا اور کتابیں پکڑا کر واپس جانے کو مڑا۔ مجھے جانے کیا ہوا کہ اُسے پیچھے سے آواز دے دی۔ کہتے ہیں کہ پیچھے سے آواز نہیں دینی چاہئے اور پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی نہیں چاہئے ورنہ آدمی پتھر کا ہو جاتا ہے مگر مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ کیا معلوم پیچھے کھڑا آدمی ہمارے نہ مڑنے سے پتھر ہو جائے لیکن وہ ایسی سوچوں سے بے پروا مڑا اور میری چائے کی دعوت دو بار انکار کرنے کے بعد قبول کر لی۔ مَیں نے اُسے بیٹھک میں بٹھایا، خود جلدی جلدی کیتلی میں تھوڑا اور پانی ڈال کر چائے بنا لایا۔ اُس نے شرمندہ شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ چائے کے تین چار گھونٹ بھرنے کے بعد رک کر کہا، ''مجھے آپ سے ایک کم تھا۔ اچھا ہوا ملاقات ہو گئی۔ چائے کا تکلف کیتا سر جی۔''

اُس کے منہ سے لفظ کام سن کر کپ میری انگلیوں میں ذرا سا کپکپایا مگر میں نے خوش مزاجی برقرار رکھی، ''حکم کریں۔''

''سر جی دو بچے نیں۔ دونوں معذور۔ اے سمجھو پہلا منڈا جب آٹھ سال کا ہویا، کمر باہر نکل آئی، ٹانگیں دوہری ہو گئیں، سمجھو وی بن گئیں۔ بڑے علاج کرائے۔ کچھ نئیں ہو یا۔ باپ نکو نک مقروض۔'' اور وہ کہیں کھو گیا۔ مَیں بھی چند لمحے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر اُسے یاد دلایا کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے تو اُس نے پرانے زمانے کی بی بیوں ایسی آہ بھری۔۔۔ہائے۔۔

''دوسرا لڑکا ٹھیک ہے؟''

''نئیں جی۔ اُس کا بھی یہی حال۔ آٹھ سال کا ہو کر پہلے ورگا ہو گیا۔ اے سمجھو ڈاکٹروں کو بھی سمجھ نئیں آئی۔ بڑا علاج کرایا۔ ہن قرضے ای قرضے۔''

''اللہ بہتر کرے گا۔''

''ٹٹی پیشاب بھی آپ نئیں کر سکتے۔ سمجھو ہر کم خود کرنا پڑتا ہے۔ منہ چ نوالے پانے پڑتے ہیں۔''

''ہوں۔۔۔''

''ماں پیو زندہ نیں۔ کردے نیں۔ مر جان گے تے فیر؟''

''اللہ مالک۔۔''

''سر جی تسی رائٹر او۔ کچھ لکھو۔ حکومت دی توجہ دلاؤ۔ مالی امداد نئیں چاہیے۔ بس علاج کرادے۔''

اُس کی رائٹر والی بات سن کر زہر خند مسکراہٹ آتے آتے رہ گئی، مسکین صورت بنائے رکھی اور اُس کی باتیں سنتا رہا اگر چہ کچھ بھی سن نہیں پا رہا تھا، دماغ نے کام بند کر دیا تھا اور مَیں اسی بند دماغ میں کھو گیا تھا کہ اُس نے کیا توقع کی ہے اور مَیں۔۔۔ مَیں جو اُس کی نگاہوں میں ایک رائٹر ہوں، کروں تو کیا کروں؟ میرے بس میں ہے کیا؟ پیشہ وارانہ لحاظ سے ایک خبر؟ اور پاگل پن کی دہلیز پر ایک افسانہ؟ اور مَیں بے بسی کی گہری کھائی میں گر گیا

جہاں سے مجھے اُمید مانگتی آواز نے نکالا۔

''اچھا سر جی۔ چائے دا تکلف کیتا۔ کچھ لکھنا ضرور۔''

اُسے دروازے تک چھوڑنے جاتے جاتے مَیں کہانی کے بھنور میں گھر چکا تھا۔ خیال آیا کہ کہانی یوں شروع کروں کہ قصہ کہتے کہتے سبھی کو لپیٹ میں لیتا جاؤں جو معذور بچوں کو بچہ نہیں سمجھتے، جو تو انا بچوں کو بھی نہیں بخشتے، لولا لنگڑا بنا دیتے ہیں، ٹھٹھا اڑاتے ہیں کہ وہ دیکھو ٹنڈا، وہ دیکھو لنگڑا، اور وہ حرام زادے یہ نہیں کہتے کہ وہ دیکھو ساجد، وہ دیکھو ماجد، اور تو اور اپنے بچوں سے بھی لاڈی لاڈی کے نام پر یوں کھیلتے ہیں جیسے وہ جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ کھلونے ہیں۔ اور وہ خبیث جو عذاب کی طرح نازل نہیں ہوئے، نہیں جان پاتے، جان جائیں تو سمجھ نہیں پاتے کہ بچے صرف بچے ہوتے ہیں جنہیں وُہ روشن راہوں میں مار دیتے ہیں۔ مَیں کیا کیا کہوں کہ سرِ عام دولے شاہ کے چوہے بنائے جاتے ہیں۔ ہوسنا کی کا شکار کر کے عمر بھر کا روگی بنائے جاتے ہیں، انتقام کے بیج بوئے جاتے ہیں جو تناور ہو کر نفر یلے پھل پھینکتے ہیں، جو پھر سے معصوم آنکھوں سے شرارت چھین کر آنسو بھر دیتے ہیں، ہاتھوں میں چھالے ڈال دیتے ہیں اور پیروں کی ایڑیاں ننگی تپتی زمین پر جھلنے، رگڑنے، کٹنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور پھر اخلاقیات کے بھاشن بھی دیے جاتے ہیں۔

مجھے ہنسی آئی کہ اِس عالمِ وحشت میں وحید کے بچوں کے ساتھ بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ اگر وہ زندہ رہے اور چل پھر پائے تو کسی چوک میں آوارہ مزاج ماں باپ کے لڑکوں کے روڑے کھائیں گے، گالیاں بکیں گے، ٹھڈے کھائیں گے اور یونہی رُلتے رُلتے مارے جائیں گے۔ آہ وہ مارے جائیں گے جنہیں سانس ملی، زندگی نہیں ملی۔ اُس نے جانے کیا سوچ کر کہا تھا کہ مَیں رائٹر ہوں، میں کچھ لکھوں، حکومت کی توجہ دلاؤں۔ کس حکومت کی؟ جو کالی طاقتوں کے ایک ٹولے کا نام ہے جو نام اور چہرے بدلتا رہتا ہے مگر کرتوت کبھی نہیں بدلے۔ اسی ٹولے نے کنویں کا مینڈک بنا دیا ہے، اُس کنویں کا مینڈک جسے کچھ لوگ پاگل

خانہ بھی کہتے ہیں، جہاں اچھے بھلے لوگ پاگل بنائے جاتے ہیں تا کہ گلشن کا کاروبار چلتا رہے، جہاں جنونیوں کو ہار پہنائے جاتے ہیں تا کہ پاگل پن بڑھتا رہے اور لوگ اسی پاگل پن کے دائرے میں گھومتے رہیں اور وہ ٹولا اِن پاگلوں سے پرے، بہت پرے، تماشا دیکھتا رہے، بھلے اوپر سے لعن طعن کرتا رہے۔

اور اُس نے جانے کیا سوچ کر کہا تھا کہ رائٹر ہو، کچھ لکھو۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ مَیں ایک عرصے سے کچھ بھی نہیں لکھ پایا۔ خیالات کے ریلے آتے ہیں، بہہ بہا جاتے ہیں اور مَیں کڑھتا رہتا ہوں۔ تصویریں ابھرتی ہیں، ڈوب جاتی ہیں اور مَیں کڑھتا رہتا ہوں۔ اُسے کیا معلوم کہ اک چاند چہرہ نے میری آنکھیں چندھیا دی ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ مَیں وہیں کھڑا ہوں جہاں وہ چھوڑ گئی تھی اور یہی سمجھ نہیں پا رہا کہ قصور کس کا تھا؟ وہ کیا جانے کہ مَیں نے اُسے کتنی آوازیں دیں، اتنی آوازیں دیں کہ میری اپنی آواز کہیں گم ہو گئی۔ مَیں نے اپنی آواز کا صدقہ بھی مانگا مگر وہ چاند چہرہ کہ سورج سوچ کہ جس کے ہوتے میرے من میں نور کا دریا بہتا تھا، چاندنی لیے چلی گئی، اندھیرا چھوڑ گئی۔

مَیں کیا لکھوں کہ میں اُسی اندھیرے میں سرگرداں ہوں اور اُسی چاندنی کی چاہ میں چکرا چکا ہوں۔ میں کسی کو کیا راہ دکھاؤں؟ کسی کو کیا متوجہ کروں؟ میرے ڈاک بابو میں تمہارے لیے، تمہارے بچوں کے لیے کیا لکھوں؟

یہ سوال میں نے اتنی بار خود سے پوچھا کہ میں بے کل ہو گیا۔ بے کلی کو وحید کے فون مہمیز کرتے رہتے تھے۔ مجھے وحید کو شکریہ کہنا چاہیے تھا کہ مجھے اُس نے میرے مہجور کوزوں کی جانب واپسی کی راہ دکھائی۔ میں بھی کیا خود غرض آدمی ہوں اور کون ہے جو خود غرض نہیں؟ جو نہیں ہے وہ نہیں رہتا، اُسے رہنا چاہیے، تا کہ یہ جگہ رہنے لائق رہے۔ لیکن کون پروا کرتا ہے؟ کوئی تو کرتا ہوگا البتہ میں نے اول اول پروا نہیں کی مگر پھر کچھ ایسا ہوا کہ میں بے خود ہو گیا اور بے خودی سے اچھا کیا ہو سکتا ہے اگر مَیں واقعی رائٹر ہوں اگرچہ میں نے کبھی اس کا

دعویٰ نہیں کیا۔ یوں تو میں بھی کیا خاک رائٹر ہوں جو اپنے غم سے نہیں اُبھر سکتا۔ اُبھروں بھی تو کہاں جاؤں جہاں غم نہ ہو؟ اس جہاں میں تو یہ ممکن نہیں کم از کم اور کوئی اور جہاں، کیا معلوم، کیا ہو؟

معلوم اور نا معلوم کے درمیان جھولتے جھولتے ایک روز مَیں نے جی کڑا کیا اور کچھ رفقائے کار سے بات کی۔ سبھی نے اظہارِ افسوس کیا مگر بہتری کا کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تو میں نے ایک خاتون رپورٹر سے بات کی جو اچھی رپورٹ کی تلاش میں کیمرہ مین لے کر بتائے پتے پر پہنچ گئی اور سچی بات یہ ہے کہ اُس نے ٹی وی پر رپورٹ واقعی بڑے دردناک انداز میں پیش کی۔ اُس نے اربابِ اختیار سے بھی رابطہ کیا جنہوں نے ہر ممکن امداد کی یقین دہانی کرائی۔ وحید کا مجھے فون بھی آیا اور اس کی آواز میں لجاجت کے بجائے خوشی تھی جس پر مجھے کچھ اطمینان ہوا اگر چہ مجھے خدشہ بھی تھا کہ جانے امداد ہو یا نہ ہو۔ عمر گزری ہے وعدے اور دعوے سنتے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ امدادی چیک دیے گئے اور کیش نہ ہوئے اور ان میں سرکاری بھی شامل تھے اور غیر سرکاری بھی۔ کچھ روز گزرے تو رابطہ کیا کہ عملی طور پر بھی کچھ ہوا؟ اور اُس نے بتایا، ''او جی علاج شروع ہوگیا اے۔ دعا کرو۔'' اور مَیں نے دعا دی اور تسلی دی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

مَیں نے خود کو بھی سمجھایا اور ایڑیاں رگڑنے لگا کہ چشمہ اُبل پڑے، حیات بخش پانی ملے مگر وہ اک غم ۔۔۔ طاقت بننے کے بجائے کمزوری بن گیا اور میں اُس میں سے نت نئے افسانے نکالنے میں ناکام رہا گو میں نے جی جان سے چاہا۔ یوں بھی اُس نے بڑے مان سے کہا تھا، ''سر جی، تسی رائٹر او، کچھ لکھو۔'' میں کچھ لکھنے کا آغاز کرتا تو وہ آجاتی اور وحید پیچھے رہ جاتا۔ اُس کے دو بچے، جو اول اول اُس نے اپنے بھائی کے بتائے تھے، وہ بھی پیچھے رہ جاتے اور میں ڈوب جاتا۔ میں اُسے کبھی کہتا تھا کہ میں ہر کردار میں سے کہانی نکال سکتا ہوں اور اب ۔۔۔ وحید اور اس کے بچے میری راہ تک رہے تھے اور مَیں اُن کے لیے دعا کر کے خود کو تسلی دے رہا تھا۔

کوئی کیا جانے کہ بال بچے دار آدمی کا کسی گُل رُخ کو اپنے میں حلول کر لینا کیا غضب ڈھاتا ہے۔ وحید اِسے حماقت ہی سمجھے گا لیکن اُسے کیا معلوم کہ شادی کے بعد عشق ہی دراصل معاشقہ ہوتا ہے جو محض اک بدن کا حصول نہیں ہوتا بلکہ اپنے خلا پُر کرنے کی تمنا دوڑائے پھرتی ہے یہاں وہاں لیکن مَیں اُس کے خلا، وحید کے خلا، اُس کے بچوں کے خلا، تمام بچوں کی زندگیوں میں پیدا کیے گئے خلا پُر کرنا چاہتا ہوں اور خود کو بے بس بھی پاتا ہوں۔

شاید انہی خلاؤں سے میرے دماغ میں خلل آ گیا تھا ورنہ وہ تو بار بار سکرین صاف کرتی رہی۔ دور رہو مجھ سے۔ دوری ہی بہتر ہے۔ مجھ سے دوری پر تم پھلتے پھولتے ہو۔ میں کوئی اچھی ساتھی نہیں۔ عارضی سہارے نہ ڈھونڈو۔ ہر آدمی اپنی ذات میں تنہا ہے۔ یوں بھی مجھے تم سے کوئی لگاؤ نہیں تو جاؤ اپنا راستہ ناپو بلا۔ بلا۔ بلا' مگر میرے خلا اور خلل ۔۔۔ وہ مجھے بار بار بتاتی رہی کہ میرے دماغ میں کیڑے ہیں اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ وہ دنیا جہان کی ہر خرابی مجھ میں نکالنے لگی لیکن کون کمبخت اُس ہستی کے قریب نہیں رہنا چاہتا جس کی قربت لاشعوری طور پر خوشی کا احساس جگائے رکھے اور غم دے تو یوں دے کہ غمِ دنیا بھلا دے۔

اب مَیں جو جی چاہے کہوں مگر قصور امیرا ہے تو سہی کہ اُس نے بھی رائٹر جان کر انگلی پکڑائی اور میں پوری ہتھیانے کے چکر میں یوں پڑ گیا کہ مجھے چکر آنے لگے۔ میری قاری، میری پیاری میں ایک کمال کی کلاکار چھپی ہوئی تھی اور چھپایا بھی اُس نے خود تھا، بہت اُکسایا مگر وہ ظاہر کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ مَیں نے کامل یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ جب بولتی ہے تو اُس کے جملے اس قدر تخلیقی، اس قدر کٹیلے ہوتے ہیں کہ میں نشانے پر ہونے کے باوجود عش عش کر اٹھتا ہوں اور اگر وہ لکھے تو کیا قیامت ہو۔ ہائے ہائے۔ اور خیالات، ہنگامہ خیز خیالات، اگر ہیجانی کیفیت سے نکل کر بولے تو دانش کے موتی بکھیرتی ہے اور شعر جو کبھی کبھار کہتی ہے، چھوٹی بحر میں بڑی کیفیت کا یوں اظہار کرتی ہے کہ سبحان اللہ مگر اُس نے چاند سا چہرہ میرے قریب لاتے ہوئے ایک ادا سے کہا تھا۔

''میں رائٹر نہیں بننا چاہتی، رائٹر کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''

اِس جملے نے اور اُس ادا نے کبھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ میری ذات کو مجھ پر یوں عیاں کرتی کہ میں حیران ہو جاتا اور خود سے پوچھتا کہ وہ کیسے مجھے اتنا جانتی ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا؟ اور جب میں نے یہی بات اُس سے پوچھی تھی تو اُس کے چہرے پر ایک مسکان پھیلی تھی مگر آنکھوں میں اُداسی چھپ نہیں پائی تھی۔ وہ چند ساعتیں دیکھتی رہی، خاموشی سے دیکھتی رہی اور شانِ بے نیازی سے منہ موڑتے ہوئے بولی تھی۔

''کیونکہ میں سوچتی بہت ہوں۔''

معلوم نہیں کیا کیا سوچتی تھی مگر میں سوچتا ہوں کہ جو بننا چاہتی تھی وہ بن نہ پائی اور یوں بھرے پرے گھونسلے میں تنہا پرندہ پھڑ پھڑاتا رہا جبھی وہ جانے کیا کیا سوچتی رہی کہ ایک بار اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں اُسے صرف ایک دلچسپ کردار سمجھتا ہوں اور جس دن اُس نے میری ذات میں کھلنے والی کھڑکیاں مجھ پر کھولنا بند کر دیں، میری اُس میں دلچسپی تمام ہو جائے گی اور میں اپنی راہ بدل لوں گا مگر مَیں تو وہیں کھڑا ہوں، اُسی راہ پر، اُسی چاہ میں مگر وہ...... میں جانتا تھا کہ میں خطرناک راستے پر ہوں مگر میں چلتا رہا۔ وہ جتنا پرے کرتی، میرے جی کے اور قریب ہو جاتی اور یقیناً یہ میری فنتاسی کا کرشمہ ہے اور یقیناً وہ بھی کرشماتی، جو بھی ہو، وہ پہلے میری تھی نہ بعد میں میری ہوئی، بس مَیں یہ تسلیم نہیں کر پا رہا تھا مگر میں بھی کیا کرتا کہ وہ اتنی پیاری، اتنی پیاری۔۔۔لیکن مجھے اُسے کوئی دوش نہ دینا چاہئے مگر میں دیتا ہوں اور دیتا رہوں گا اور خود کو کوستا بھی رہوں گا جیسے میں اب وحید کے بچوں کے بارے میں پچھتاتا ہوں۔

مجھے بارہا خیال آیا کہ خبر لگوا کر، چلوا کر مَیں نے اپنا حصہ ڈال دیا مگر مجھے یقین کبھی نہ آیا کہ یہی میرا حصہ تھا سو مجھے اُلجھن ہوتی رہتی کہ کچھ اور کر سکوں، کچھ لکھ سکوں اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے واقعی لکھنا چاہا مگر لکھ نہ سکا کہ وحید کچھ عرصے کے لیے یوں غائب ہو گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ اپنے آپ میں بھی نہیں تھا۔ وہ مارا مارا پھر رہا تھا کہ بچوں کی بیماری کو پُراسرار اور لاعلاج قرار دے دیا گیا تھا اور وہ دوبارہ نکونک قرض میں ڈوب چکا تھا مگر وہ مجھے

ملتا نہیں تھا اور کہتا بھی نہیں تھا۔۔۔او جی تسی رائٹر او، کچھ لکھو، حکومت دی توجہ دلاؤ۔

مَیں نے شرم کے مارے ایک دو اور لوگوں سے رابطے کیے کہ اس طرح کی صورت حال میں کیا ہو سکتا ہے؟ کوئی ایسا ادارہ جو بچوں کی کُل وقتی دیکھ بھال کی ذمہ داری لے لے؟ ایک سرکاری ادارے کی خبر ملی تو میں وہاں جا پہنچا مگر وہ صرف لاوارث بچوں کو لیتے ہیں۔ دوسرے ادارے کا معلوم ہوا مگر وہاں بااثر لوگوں کے بچے ہی جا سکتے ہیں اور زیادہ امیر لوگ تو اپنے بچوں کو دوسرے دیسوں میں لے جاتے ہیں۔ پریشان ہوا کہ ڈاک بابو کے بچوں کے لیے بھی کوئی اطمینان بخش ادارہ ہونا چاہیے، بھلے نام کو ہو، کچھ بھرم رہ جائے مگر کسے پروا ہے بھرم کی، جب دھرم کے نام پر لوگ لٹو بن چکے ہوں، لٹ رہے ہوں، لوٹ رہے ہوں تو کیا بھرم، کیا دھرم، جب منشا ہی لوٹ مار ہو لیکن مَیں بھرم قائم رکھنے کے لیے ایک دن ڈاک خانے پہنچ گیا۔

وہ کام پر ابھی آیا نہیں تھا سو مَیں ڈاک خانے کی بیرونی دیوار کے ساتھ بنے چائے کے کھوکھے پر بیٹھ کر سُرکیاں لینے لگا۔ سڑک پر ٹریفک تھا کہ قیامت کا منظر۔۔۔کار سوار اپنی گاڑی کو چپ پڑنے کے خوف سے کچھ محتاط تھے مگر موٹر سائیکل سوار لڑکے توبہ اور ان سے بھی بھیانک ڈرائیونگ کرتے رکشہ ڈرائیور۔۔۔حیرانی ہوئی کہ انھیں زندگی سے پیار نہیں یا پاگل پن کی حد تک خود پر اعتماد ہے؟ جو بھی ہو، میری نظر متحرک مشینوں میں جا مد نو دس سال کے بچے پر ٹک گئی جو سڑک کے ایک کنارے سائیکل رو کے راستہ ملنے کا منتظر تھا مگر ٹریفک تھا کہ۔۔۔وہ آٹھ سے دس منٹ وہیں کھڑا رہا کہ کوئی راستہ دے تو وہ دوسرے کنارے پہنچ کر اپنی گلی کو مڑ جائے اور نہ جانے وہ کتنی دیر وہیں کھڑا رہتا کہ میرا ڈاک بابو کہیں سے ٹپک پڑا اور دایاں بازو پھیلائے بچے کے لیے راستہ بنانے لگا۔ اُسے کچھ گالیاں بھی پڑیں لیکن اُس نے سڑک پار کرا کے چھوڑی اور خود بچتا بچاتا ڈاک خانے کے دروازے تک پہنچ گیا اور تبھی میں نے پیچھے سے آواز دی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا اور کان کے پیچھے کھجلی کرتا، مسکراتا ہوا چلا آیا اور آتے ہی ڈاک نہ پہنچانے کا عذر بیان کرنے لگا مگر میں نے روک دیا اور پوچھا۔

''بچے کیسے ہیں؟''

''وہ جی آپ کا ایک جاننے والا علاج کرا رہیا اے۔ باقی ٹھیک اے، بس بچوں کی ماں اجکل بیمار اے۔ بڑی پریشانی اے۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کرو۔'' اور اُس کے لیے چائے منگوائی جو پیتے ہوئے اُس نے فکرمندی ظاہر کی کہ بچوں کی ماں کو کچھ ہو گیا تو وہ اکیلا کیسے سنبھال پائے گا؟ وہ نوکری کرے گا یا گھر پر رہے گا؟ وہ ابھی سے پوچھتی ہے کہ ہمارے بعد ہمارے بچوں کا کیا ہوگا؟ مَیں خاموشی سے سنتا رہا کہ کیسے اُس کی بیوی کھلانے سے نہلانے تک سارے کام اکیلے کرتی ہے اور جب وہ سو رہے ہوتے ہیں تو کیسے سرہانے بیٹھی موتی رولتی ہے، نصیب کوستی ہے۔ کیا یہی تقدیر ہے؟ اور اگر یہی تقدیر ہے تو کیسی تقدیر ہے؟ کہیں یہ آزمائش تو نہیں؟ میرے ابا کہتے تھے کہ یہ اُس خاندان کی آزمائش نہیں ہوتی بلکہ یہ پورے معاشرے کا امتحان ہوتا ہے اور ہم اِس میں فیل ہو چکے ہیں لیکن میں اُسے فیل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا اگرچہ میں نے دیکھا کہ لوگ تندرست بچے کو بھی راستہ نہیں دے رہے تھے لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ کیا کروں؟ سو میں نے اُس کی ہمت بندھائی اور ڈاک لے کر واپس آ گیا اور اِک چاند چہرہ کے ہجر میں کھو گیا اور یوں کھو گیا کہ ایک روز میری بیوی تانیہ میز پر کھانا لگا رہی تھی اور میں نے کہہ دیا کہ بانو، پہلے پانی دے دو۔۔۔اور وہ میکے چلی گئی۔۔۔

اور وہ چلی گئی۔ اب میں تھا، میرے دکھ اور وحید اور اُس کے بچوں کے دکھ مگر ایک اکیلا کیا کر سکتا ہے سو مَیں نے وہی کیا جو میں سب سے اچھا کر سکتا ہوں اور 'درداں دی ماری دِلڑی' کی کہانی لکھ دی کہ وحید کی بیوی ایک رات سوئی تو دوبارہ نہ اٹھی اور چند مہینوں میں پہلا بچہ ماں ماں کرتا کہیں دور، بہت دور چلا گیا اور دوسرا ابھی دروازے کی طرف بڑھ رہا ہے۔

چھ اپریل دو ہزار اٹھارہ عیسوی

غرقاب

مَیں نے آج تک سمندر نہیں دیکھا۔ ٹی وی لاؤنج کی دیوار پر آویزاں ایل سی ڈی میں لہراتی موجیں دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اِن کے ساتھ ساتھ جاؤں دور تک۔۔۔

میں ایک خواب دیکھتا ہوں۔ عمرِ عزیز پچاس برس سے اوپر ہو تو ایک بڑی سی کشتی خرید لوں اور اِس میں ڈھیروں کتابیں اور کھانے پینے کی اشیاء بھر کر بحری سفر پر نکل جاؤں۔ سمندر میں رہنا شروع کر دوں اور بس پڑھوں، لکھوں اور سوتا رہوں۔ ہر طرف پھیلے پانی کو دیکھوں جو لوگوں کے لیے رزق چھپائے رکھتا ہے اور کشٹ کرنے پر اُگل دیتا ہے۔ موت کا باعث بنتا ہے مگر اس میں زندگی بھی سانس لیتی ہے۔

پانی۔۔۔ ہر طرف پانی جس میں بڑی مچھلیاں زندہ رہنے کے لیے چھوٹی مچھلیوں کو کھاتی ہیں اور زندگی یوں ہی موجوں کی طرح اوپر نیچے، آگے پیچھے ہوتی رہتی ہے، میرے خواب کی طرح۔۔۔ کسی کو یہ خواب جیسا بھی لگے، مجھے پروا نہیں کیونکہ یہ میرا خواب ہے جو میں دیکھتا رہوں گا کہ میں سمندر میں ہوں۔ ایک کشتی میں ہوں۔ خشکی سے دور۔۔۔ بہت دور۔۔۔ موٹی موٹی کتابوں کے درمیان دبلا پتلا سا میں۔۔۔ حروف کے سمندر میں غوطہ زن۔۔۔ فطرت کی گود میں زندگی گزارتا ہوا۔

جی چاہتا ہے کہ ساحل پر ایک گھر بنا لوں۔ لوگ ریت سے گھروندے بناتے ہیں جو ٹھیر نہیں پاتے۔ میں بھی ایک بناؤں لیکن پکا والا۔۔۔ اتنا مضبوط کہ طوفانی موجیں بھی نہ ڈھا سکیں۔ گھر کے باہر آرام کرسی رکھ کر تا حدِ نظر پھیلے پانی کو دیکھوں جس کے پار اُبھرتے

سورج کی کرنیں مجھ میں بے قابو ہو جانے والی توانائی بھر دیں اور سمندر پار گم ہوتا آفتاب مجھے لوری سنا جائے۔ کبھی سوچتا ہوں کہ وہاں جا کر بیٹھ جاؤں جہاں موجیں میرے قدموں میں آ کر دم توڑ دیں۔ موجیں جو بڑے بڑے جہازوں کو الٹانے میں دیر نہیں لگاتیں، پورے پورے شہر نگل لیتی ہیں، اور کچھ خاص لوگوں کی طرح ہمارا مال اپنے پیٹ میں بھی چھپا لے جاتی ہیں، میرے قدم چوم کر لوٹ جائیں۔

افسوس کہ مَیں سمندر سے بہت دور ہوں گو اتنا دور بھی نہیں کہ جا نہ سکوں لیکن۔۔۔ مَیں مہم جوئی پر مبنی فلمیں دیکھنے پر اکتفا کرتا ہوں جو سمندر کی زندگی پر بنی ہوتی ہیں۔ مجھے ایسی دستاویزی فلمیں بھی بہت پسند ہیں جن میں پانی کے نیچے رہنے والی رنگ برنگی، دل للچانے اور ڈرانے والی مخلوق نظر آتی ہے مگر سکرین پر دیکھ کر اُکتا سا جاتا ہوں۔ میں پانی میں اتر کر دیکھنا چاہتا ہوں ہر چیز جو اِس میں چھپی ہوئی ہے۔ جان داروں کے ساتھ ساتھ آبی پودے، گڑھے اور غاریں۔۔۔ وہ غاریں جن میں بڑے جان داروں نے اپنا ٹھکانا بنایا ہوتا ہے اور علیحدہ علیحدہ نظر آنے والے پتھر چوموں جو پہاڑوں کی یادگار ہیں۔ مونگوں کی چٹانوں سے اپنی مرضی کے ٹکڑے بھی تراشنا چاہتا ہوں جو میں اپنے گھر کے خاص کمرے میں آتش دان پر سجا سکوں۔ سیپ کو اپنے داہنے ہاتھ کی دو بڑی انگلیوں اور انگوٹھے کے درمیان رگڑنا چاہتا ہوں اور اِس میں سے موتی بھی پانے کی تمنا ہے جس کی چمک لوگوں کی آنکھیں پھیر دیتی ہے۔ میں وہ سب محسوس کرنا چاہتا ہوں اندر تک۔۔۔ جو پانی کے اوپر اور نیچے ہے۔۔۔ اور اطمینان کرلوں کہ یہ دنیا واقعی اتنی رنگیں ہے جتنی سکرین پر دکھائی جاتی ہے اگرچہ مجھے یقین ہے کہ یہ کہیں بڑی ساحرہ ہے۔

میں صرف سکرین پر سمندر نہیں دیکھتا بلکہ کاغذوں پر اُترے ہوئے حروف میں بھی سحر تلاشتا ہوں۔ مجھے ہرمن میلول کی موبی ڈک پسند ہے جو شکاری اور شکار کے درمیان رومان کی ان مٹ داستان ہے۔ ارنسٹ ہیمنگوے کی وہ کہانی بھی کئی بار پڑھی ہے جس میں ایک

بوڑھا مچھلی پکڑنے جاتا ہے اور ایک بہت بڑی مچھلی اُس کے ساتھ کھیلنے لگتی ہے۔ وہ جیت کر بھی ہار جاتا ہے لیکن ناکامی میں اُس کی کامیابی چھپی ہوتی ہے کیونکہ اُس کا حوصلہ باقی رہتا ہے۔۔۔اور اَنگ اَنگ میں جوش بھر دینے والی اوڈیسی تو میرے سرہانے تلے دھری رہتی ہے۔ جب جی چاہتا ہے، کتاب کھولتا ہوں اور اِس میں کھو جاتا ہوں کہ میں ایک بڑی کشتی میں ہوں جو بادبانوں کے سہارے ہوا کے دباؤ پر بہہ رہی ہے اور کبھی کبھی ہچکولے کھاتی ہے میرے خیالات کی طرح۔۔۔اور مَیں طے نہیں کر پاتا کہ سمندر دیکھنا ہے تو کراچی جا کر دیکھ لوں یا اس سے آگے ساحلی پٹی پر سفر کرتے ہوئے گوادر تک جاؤں اور راستے میں بھانت بھانت کے لوگوں سے ملوں کہ حقیقی علم تو وہی ہے جو انسانوں سے مل کر ملتا ہے۔ سمندر کی منہ زور موجوں کے سامنے اب تک ڈٹی بستیاں دیکھوں جن میں رہنے والوں کی زندگی پتا نہیں کیسی ہوگی۔ ہر وقت کے شور وغل سے مضمحل اعصاب والے شہریوں سے تو بہت مختلف ہوگی۔

میں نے پڑھا ہے کہ کراچی کے ساحلی علاقے شام کے وقت بڑا دل کش نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں روشنیوں کے اِس مشہور شہر میں، جواب گولیوں کی تڑتڑ سے بدنام ہو چکا ہے، آسماں کا پیچھا کرتی عمارتوں کا عکس جب سمندر پر پڑتا ہوگا تو کیا نظر آتا ہوگا؟ کیا وہ اتنی ہی پُرکشش دکھائی دیں گی جیسی سر اوپر اٹھا کر دیکھنے سے محسوس ہوتی ہیں؟ جب پانی میں ڈوبتی عمارتوں کو دیکھنے کے لیے سر جھکانا پڑے گا تو اُن کی یا میری شان میں فرق آئے گا؟

اور چاہتا ہوں کہ سمندر کے بیٹے جب مچھلی پکڑنے جائیں تو ان میں سے کسی کی کشتی پر سوار ہو جاؤں جو گہرے پانیوں میں جائے گی کیونکہ قریب قریب ساری مچھلیاں بڑے ٹریلر کھا چکے ہیں جن سے وابستہ مچھیرے روز مچھلی پکڑنے کے باوجود خود نہیں کھا سکتے۔ ساحل کے نزدیک مچھلی تو دور کی بات ہے، سمندر کا پانی بھی دریائی پانیوں کے ساتھ آتی

گندگی، کارخانوں کا تیزابی پانی اور بندرگاہ سے بہایا جانے والا تیل نگل چکا ہے۔ عفریت کی طرح پھیلے شہر کی اپنی گندگی بھی رہی سہی کسر نکال رہی ہے۔ پھر بھی سارے ملک سے لوگ کراچی جاتے ہیں سمندر کے کنارے خوشی ڈھونڈنے کے لیے۔۔۔ میں بھی جانا چاہتا ہوں۔ پانی کے باہر اور اندر بنتے مٹتے نقوش سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں اور آگے بڑھ کر ہوا کے دروازے پر دستک دینا چاہتا ہوں۔

ہر منظر کی پانی پر علیحدہ چھاپ دیکھنے کی چاہ بھی عجیب ہے۔ جب ہلکے بادل ہوں گے تو سمندر کیسا ہوگا؟ گہری کالی گھٹائیں سطح آب کو ڈراؤنا بنا دیں گی یا سحر انگیز۔۔۔ رات کو کالی چادر اوڑھے سمندر کیا کرتا ہوگا؟ اور دن میں کیسا روپ بھرتا ہوگا؟ سوچتا ہوں کہ ساحلی پٹی پر سفر کے دوران ہر لمحہ گاڑی کی رفتار کے ساتھ منظر بدلے گا تو میرے باطن میں بھی تبدیلی کی لہریں اُٹھیں گی۔ سورج کی کرنوں سے میرے بائیں ہاتھ موجود چیزیں دائیں جانب پانی پر کتنا حسین عکس پھینکیں گی۔ مناظر ہیبت ناک بھی ہوں گے لیکن تحیر مجھے آن لے گا اور جب منزل پر پہنچ جاؤں گا تو وہاں ہزاروں سال سے سانسیں لیتے شہر کو ملتی نئی زندگی دیکھوں گا۔ سنا ہے کہ نیا جنم پرانے سے زیادہ خوبصورت ہوگا۔ وہاں ایک نئی بندرگاہ بھی بن رہی ہے جو کہتے ہیں کہ خوشحالی کا دروازہ کھولے گی اور منقول ہے کہ اس کی بدولت یہ شہر بلوچوں کو ایک ہی جھٹکے میں غاروں کی دنیا سے نکال کر اکیسویں صدی میں لاسکتا ہے۔

میں اس شہر کو دیکھنا چاہتا ہوں جو خواب دکھانے لگا ہے۔ پتا نہیں پورے ہوں گے یا نہیں۔ میں خوابوں کے ٹوٹنے سے ڈرتا ہوں اور اس وقت سے پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ سبز باغ محاورے سے نکل کر روزمرہ کا روپ دھارلے گا۔ مجھے مائل کرے گا کہ میں اسی باغ کے کسی گوشے میں بس جاؤں یا اس کے آس پاس کہیں اپنا کوئی درخت اُگالوں جو میٹھے میٹھے پھل دے جن پر گزر بسر کروں۔

کشتی کے راستے پانی میں اترتا اور چڑھتا رہوں۔ جی چاہے تو ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کی طرف دیکھوں جس کے پانی میں مجھے اپنے پیچھے موجود پہاڑیاں نظر آئیں۔ ٹھنڈی

ٹھنڈی ہوا لہرائے اور میرا من بہلائے۔ خیال کی حسین دنیا میں لے جائے اور اَن دیکھے مناظر دل کھول کر دکھائے۔ جب من چاہے نگر کی سیر سے تھک جاؤں تو واپس اپنے باغ میں آ کر آرام سے سو جاؤں۔ اور اِس شہر میں، جہاں میں جمایا گیا ہوں اور جس کی گندگی میں بھی اپنا ایک حسن ہے، واپس نہ آؤں کہ اب اسے بھیڑ بکریوں کا باڑہ بنا دیا گیا ہے اور چارہ بھی کم کر دیا گیا ہے۔

میں خیالی پلاؤ ہی نہیں پکاتا بلکہ عملی طور پر بھی جانا چاہتا ہوں اور ایک بار گوادر جانے کی پوری تیاری کر لی لیکن ۔۔۔ ایل سی ڈی پر سمندری دنیا کے مناظر ہی نہیں نظر آتے بلکہ ہر وقت ٹی وی پر گلا پھاڑ پھاڑ کر خبریں بھی سنائی جاتی ہیں۔ سوچا کہ وہ شہر پھر کبھی دیکھ لوں گا جو خواب دکھانے لگا ہے۔ اب کراچی جا کر دیرینہ خواہش پوری کر لیتا ہوں، اس سے پہلے کہ حسرت بن جائے لیکن ٹی وی پر صرف گوادر کے متعلق خبریں نہیں آتیں، کراچی کا ذکر بھی صبح شام ہوتا ہے۔ اس شہرِ بے مثال کو سدا کے بھوکے بھیڑیوں نے گھیر رکھا ہے اور اسے اپنا جنگل سمجھ کر دوسروں کو نوچ رہے ہیں۔ وہ شہر جہاں جنگل کے قانون سے بھی بدتر راج ہے، میرے دیس کی شریانوں میں لہو کی مانند ہے مگر کبھی سرخ اور کبھی سفید خلیوں کی زیادتی کا شکار ہو جاتا ہے۔

میں وسائل کے لیے محتاج ہوں نہ کوئی چھوٹا لڑکا ہوں۔ اپنے شہر میں، جو کبھی اپنے آپ میں بڑا پر سکون ہوتا تھا اور اب تبخیر معدہ کا شکار ہے جس کے سبب گیس سر کو چڑھ گئی اور یوں ہمہ وقت کن پٹیاں دکھتی رہتی ہیں، آدھی آدھی رات کو بھی بے مقصد گھر سے نکل پڑتا ہوں اور گاڑی میں گھومتا رہتا ہوں لیکن میں پنج پانیوں کا بیٹا پرانی بندرگاہوں کا دیس دیکھنا اور نئی بندرگاہ کے ساتھ انگڑائیاں لے رہی دھرتی کو بھی چومنا چاہتا ہوں۔ پھلوں اور پھولوں سے لدے ہرے بھرے باغوں سے سجی دھرتی کا نظارہ کرنے کی آرزو ہے جو جنگجوؤں اور جارحیت پسندوں کا کھیل تماشا دیکھنے والے سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان لے جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مرغزاروں کے دیس میں جاؤں۔ صحرا کی ریت کو ناک کے راستے اندر

گھستا محسوس کرنے کی آس میں سفر کروں۔ ٹھنڈی نیلی جھیلوں میں ٹانگیں ڈبو کر کسی سے ڈھیر ساری باتیں کروں۔ پرانی بستیوں پر بوجھ بنتے نئے شہر دیکھوں۔ جب تھک جاؤں تو ان سخت جان یودھاؤں کی دھرتی پر بسیرا کروں جنھیں لوری ملتی ہے۔۔۔ 'میرا پھول سا بچہ جواں ہوگا۔۔۔ کاندھے پہ رکھ بندوق رواں ہوگا'

اس دھرتی کے متعلق بھی عجیب وغریب آوازیں کانوں میں پڑتی رہتی ہیں مگر ہر بات سے یہی بات نکلتی ہے کہ جو دھرتی سونے سے زیادہ قیمتی ہے، اُس کے باسیوں کو روٹی بھی پوری نہیں ملتی اور تکلیف دہ امر یہ ہے کہ اُن کے مصائب کے لیے ذمہ دار بھی کوئی نہیں ٹھیرایا جاتا۔ مرکز میں بیٹھے حکمران ہوں کہ صوبے کی مالک بنی حکومت یا سردار یا وہ جن کا نام لینا عذاب کو دعوت دینا ہے۔۔۔ کوئی اپنا گناہ قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ایک دوسرے پر انگلی اٹھاتے ہیں اور مرتے وہی عام آدمی ہیں جو دنیا بھر میں مرمر کر خاص آدمیوں کے کام آرہے ہیں۔

یوں میں گھر میں گھسا رہتا ہوں جبکہ پیسے کی ریل پیل ہو تو لوگ گھر سے نکلتے ہیں لیکن میں۔۔۔ میں ٹی وی پر سمندر کی ہیبت ناک خوبصورتی دیکھ کر اسے چھونے کی تمنا کرتا ہوں اور خواب دیکھتا ہوں کہ میں ہوا کا دروازہ کھول رہا ہوں۔ آنکھیں بند کیے، بانہیں پھیلائے ،ریت میں پاؤں دھنسائے کھڑا ہوں۔ سمندر پر تیرتی ٹھنڈی ہوا میرے روم روم میں اطمینان کی لہر بھر رہی ہے لیکن یہ کیا کہ گرم ہوا کا جھونکا مجھے جگا دیتا ہے اور میں آنکھیں ملتے ہوئے دیکھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں ہیں۔۔۔ فلک بوس عمارتوں کے شہر کنارے تیرتی، پھولوں کے شہر میں پتیوں کی طرح بکھری، سرسبز وادیوں میں درختوں سے لٹکی، شناخت کر کے نا قابل شناخت بنائی لاشیں اور لاشوں کے درمیان خواب۔۔۔ خوابوں کا کیا کیا جائے؟

دو جون دو ہزار پندرہ عیسوی

اِک چُپ، سو دُکھ

(یہ افسانہ صائمہ شاہ کی نذر ہے)

ایک وقت آتا ہے جب کچھ بھی ٹھیک ٹھیک یاد نہیں رہتا اگر چہ کچھ نہ کچھ ہمیشہ یاد رہتا ہے اور وہ وقت مجھے ہمیشہ یاد رہا جب اُس نے مجھ سے کلام کیا تھا۔

یہ ایک تپتے دن کی تپش بھری شام تھی اور میں اس قہوہ خانے میں تھا جہاں لفظ ساز اکٹھے ہوتے ہیں اور خواب دیکھتے ہیں، خواب جو عذاب ہوتے ہیں، خواب جو نجات ہوتے ہیں، خواب جو خیال ہوتے ہیں، خیال جو خواب ہوتے ہیں، خواب اور خیال اور خواب۔۔۔اگر چہ ایک وقت آتا ہے جب سارے خواب پیٹ کے تنور میں راکھ ہو جاتے ہیں اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب آدمی آدمی نہیں رہتا مگر کچھ پروانے خواب اور خیال کا وبال جھیلتے ہوئے بھی خواب دیکھتے رہتے ہیں، اُن کی تعظیم لازم ہے اور اُن پر پھٹکار بھی لازم ہے جو خواب خواب الاپ کر اوروں کے خواب سراب کر دیتے ہیں۔ خواب فروشوں کی موجودگی سے پیدا ہوئی نحوست دور کرنے کے لیے میں باہر کو بڑھا کہ سگریٹ کے دو چار کش لے سکوں، جیسے ہی دروازہ کھولا تو کیا دیکھا کہ دہلیز پر ایک بچہ پڑا ہے۔

پہلی نظر میں گندگی بھری گٹھڑی معلوم دی مگر وہ ایک بچہ تھا جس کا چہرہ گردِ زمانہ نے کچھ یوں سیاہ کر دیا تھا کہ سیاہی کی تہہ علیحدہ جمی نظر آتی تھی اور مجھے یقین ہے کہ اُس کا چہرہ اچھے سے صابن سے دھویا جاتا اور اس پر لوشن لگایا جاتا تو چمک چمک جاتا اور اُس کے بدن کے اوپری حصے پر جو کپڑا تھا وہ یقیناً کبھی قمیص تھی اور شلوار کے نام پر بھی اُس نے کچھ لیرے باندھ رکھے تھے۔ میں دہلیز سے پرے کھڑا اُسے چند لمحے دیکھتا رہا، سگریٹ سلگایا اور دیکھتا رہا۔

قہوہ خانے کے اندر روشنی تھی اور باہر اندھیرا تھا اور مَیں اُس اندھیرے میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ اُسے ہلایا، نہیں ہلا، پھر ہلایا، نہیں ہلا، تیسری بار ذرا زور سے ہلایا تو اُس کے منہ سے آواز نکلی مگر اُس نے جو کہا تھا وہ میں سن نہیں سکا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سات آٹھ سال کا بچہ یہاں کر کیا رہا ہے؟ دہلیز سے دو فٹ کے فاصلے پر ایک اور تھڑی ہے،

بھلااس پر سو جائے آرام سے، یوں دروازہ بار بار کھلنے سے نیند خراب ہوتی ہوگی۔ یہی سوچ کر میں نے اُسے اٹھا کر تھڑی پر لٹا دیا اور اُس کا کاغذ چننے والا تھیلا بھی اس کے پاس رکھ دیا اور خود دس فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو کر، منہ دوسری جانب کر کے، ایک اور سگریٹ سلگا لیا جس کا ذائقہ کچھ موسم اور کچھ مزاج کی گرمی سے بدل چکا تھا۔

مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں کہ اُس وقت میرے ذہن میں کیا تھا اور مجھے کیا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ ضرور یاد ہے کہ جب مَیں نے دوسرا سگریٹ آدھا پی کر بے زاری سے سڑک پر پھینکا اور واپس مڑا تو دیکھا کہ وہ دوبارہ دہلیز پر پڑا ہے۔ اُسے اُٹھا کر بٹھایا اور پوچھا کہ طبیعت ٹھیک ہے؟ ہاں۔۔۔ ٹھیک بتائی گئی اگرچہ ٹھیک نہیں تھی۔ مَیں نے کچھ سوچ کر جیب سے پیسے نکالے اور سو روپے کا نوٹ اُس کی جیب میں ڈال دیا اور نوٹ ڈالنے سے پہلے میں نے اُس کی جیب ٹٹولی بھی تھی کہ کہیں پھٹی تو نہیں۔ اب میرے خیال میں اُسے کچھ کھانے پینے چلے جانا چاہئے تھا اور کہا بھی مگر وہ دوبارہ لیٹ گیا تو میں نے پوچھا کہ اب گھر کیوں نہیں جاتے؟

''اماں آئے گی تے جاواں گا۔''

''اچھا۔۔۔ تو ایک طرف ہو کر سو جاؤ، وہاں اُس تھڑی پر۔۔۔ دروازہ بار بار کھلنے سے نیند خراب ہوگی۔''

''ایتھے ٹھیک اے۔ دروازے تھلوں ٹھنڈی ہوا آندی اے۔''

اور سناٹا چھا گیا، گہرا سناٹا۔۔۔ مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں کہ کتنی دیر مَیں سناٹے سے سُن رہا اور مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے مڑ کر اسے دیکھا تھا یا نہیں۔ یہ ضرور یاد ہے کہ اُن دنوں بچے غائب ہونے کی خبریں بہت گرم تھیں۔

یوں مَیں نے تلخی کی ایک تہہ کھرچ کر اُس کے سامنے رکھ دی جس نے مجھ سے کلام کیا تھا اور خاموش ہو گیا، بڑی دیر خاموش رہا، اتنی دیر خاموش رہا کہ میری خاموشی اُسے کھلنے لگی جس کا چہرہ مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں اور یہ بھی یاد نہیں کہ چہرہ دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ اُس سمے اندھیرا ابھی خوب تھا اور اُس کے گرد روشنی بھی بہت خوب تھی۔ اندھیرے اور اُجالے میں مَیں نے کیا دیکھا تھا، مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں جو یاد ہے تو اُس کی آواز۔۔۔ جسے بیان کرنا

میرے لیے ممکن نہیں، اُسی آواز نے مجھے اکسایا کہ میں کچھ اور بات کروں مگر مَیں اس کے بعد اور کیا بات کرتا بھلا؟ سو میں خاموش رہا۔ وہ بھی تو خاموش رہتا ہے مگر اس وقت وہ بولا کہ میں بولوں، کچھ تو بولوں، تو میں بولا۔

یہ ایک سرد دوپہر تھی، اتنی سرد کہ بیان نہیں کی جا سکتی مگر بندۂ مزدور کو سردی کیا اور گرمی کیا، اُسے تو پیٹ کا تنور بھرنا ہی پڑتا ہے۔ تھوڑا سا چلنے پھرنے سے ناک بہا دینے والی یخ بستہ دوپہر میں مجھے موٹر سائیکل پر کام پر جانا پڑ رہا تھا اور جب مَیں ایک وزیر کی قیام گاہ کو جانے والی تنگ سڑک کو مڑا اور تھوڑا سا آگے بڑھا تو کیا دیکھا؟ نہ دیکھتا تو اچھا تھا مگر میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا بچہ، جس کا ناف سے نچلا حصہ سارے کا سارا ننگا اور ناف سے اوپر شرٹ جو شرٹ کم چیتھڑا زیادہ تھی، کچرے کے چھوٹے سے ڈھیر کے ساتھ بیٹھا ہے اور کچھ کھا رہا ہے اور مَیں اُسے دیکھتے دیکھتے آگے بڑھ گیا مگر کچھ ہی دور جا کر موٹر سائیکل رُک گئی۔ گھڑی دیکھی۔ دیر ہو رہی تھی۔

مجھے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں اگرچہ تھوڑی سی شرمندگی ہے کہ میں اُس وقت الجھن میں پڑ گیا تھا کہ آگے جاؤں یا پیچھے۔ وہ اتنی سخت سردی میں ننگا پڑا کیوں ہے؟ چند لمحوں کی کشمکش کے بعد میں مڑا اور اُس کے پاس جا کر موٹر سائیکل روک دی اور ذرا تحکمانہ انداز میں کہا۔

''اوئے اٹھ۔ ایتھے کیہ کرر ہیا اے۔ گھر جا۔''

مگر وہ بچہ جس کی عمر لگ بھگ دس سال تھی اور قد بھی عمر کے حساب سے ٹھیک تھا مگر دبلا پتلا اتنا کہ کسی قحط زدہ علاقے کا بھک مارا نظر آتا تھا اور زیادہ بھیانک بات یہ ہے کہ اُس کے دماغ کے کافی سارے پیچ ڈھیلے تھے۔ سوچا کہ یہ پیچ ڈھیلے کیوں ہیں؟ عامل کچھ کہے گا، مولوی کچھ کہے گا، ڈاکٹر کچھ اور کہے گا اور تم کچھ نہیں کہو گے مگر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ بچہ جس کا رنگ گورا تھا مگر نظر پیلا پیلا آتا تھا، میرے تحکمانہ لہجے کے جواب میں مسکرایا اور اُس نے کچرے سے کچھ اٹھایا اور میری طرف کھانے کو بڑھا دیا۔۔۔

''بولتے جاؤ۔''

اب بولنے کو کیا رہ گیا ہے؟ تم نے اس بچے کو وہاں ٹھٹھرتی دوپہر میں دیکھا اور چُپ رہے اور مجھے کہتے ہو کہ بولتا جاؤں۔ یہ کیا مذاق ہے؟ تمہیں معلوم ہے کہ جب اُس نے کچرے سے کچھ اٹھایا اور میری طرف کھانے کو بڑھایا تو میرا جی چاہا کہ یہ دنیا بحرِ ہند میں غرق ہو جائے اور صرف وہ بچہ بچا رہے مگر مَیں۔۔۔ مَیں بے حد تُھڑ دِلا ہوں۔ مَیں نے پھر کچھ پیسے دے کر بھاگ جانا چاہا اُس بہاؤ سے جو اُس نے ہاتھ بڑھا کر میری طرف بہایا تھا مگر نہیں بھاگ سکا کہ اسی اثناء میں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا رُکا اور بچے سے یوں مخاطب ہوا جوں جانتا ہو۔ مَیں نے لڑکے سے یہ پوچھا کہ یہ بچہ کہاں رہتا ہے تو اُس نے پچاس ساٹھ فٹ دور گلی کی طرف اشارہ کیا۔ بار بار اصرار پر لڑکے نے بچے کو میرے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھایا اور خود آگے آگے چل پڑا۔

''آگے کیا ہوا؟''

تُم کہتے ہو کہ تم جانتے ہو تو مان لو کہ اب میں اور کچھ نہیں بتاؤں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم خاموش رہے۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں اُس بچے کو کچھ پیسے دے کر، دروازے پر چھوڑ کر، بھاگ گیا تھا۔ ہاں میں بھاگ گیا تھا اور بھاگتے بھاگتے اُس بچے کے گھر سے پانچ منٹ کی پیدل مسافت پر وزیر کے بڑے سے محل کے بڑے سے دروازے پر تھوک گیا تھا اور مَیں جب تک اس راستے سے گزرتا رہا، اُس کے دروازے پر تھوکتا رہا۔

''تو اس لیے تمہارے اندر نفرت کا کاڑھا اُبلتا رہتا ہے؟''

''میری نفرت ہی میری محبت ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''تم جانتے ہو تو یہ سوال کیوں؟''

''سمجھانے کے لیے۔ نفرت کی سمت درست کرنے کے لیے۔ تو بتاؤ۔''

''کیا بتاؤں؟ کیا دکھاؤں؟''

''جو جی چاہے بتاؤ، جو جی چاہے دکھاؤ۔''

''اچھا، پھر میں تمہیں اپنی یاد کے پردے پر نقش کچھ ایسا دکھاتا ہوں کہ۔۔۔''

اور مَیں نے اُسے ایک سات سالہ بچی دکھائی جس کی خالی آنکھوں میں وہ داستان بھری ہوئی تھی جو سننا چاہو تو سنی نہ جائے، نہ سننا چاہو تو اَن سنی نہ ہو، اُس کی انگلیاں ٹوٹی، کلائیاں کٹی، جبڑے تڑخے، ہونٹ پھٹے، ناک کی ہڈی پچکی، سینہ زخم زخم، ٹانگیں مڑی تڑی اور وہ گندے نالے میں بہہ رہی تھی، ساری دنیا بہہ رہی تھی۔ مَیں نے اُسے ایک اور لاش بھی دکھائی جو دن بھر روڑی پر پڑی رہی اور میں نے اُسے بچی کا باپ بھی دکھایا جو اپنے پرنے میں اپنی گڑیا سمیٹے ہسپتال جا رہا تھا کہ شاید زندہ ہو مگر وہ نہیں تھی۔ مَیں نے اُسے مَعبَد میں پنکھے سے جھولتا بچہ بھی دکھایا جس کے ماں باپ نے اپنے دوسرے بچوں کو بچانے کے لیے لوطیے کو معاف کر دیا تھا۔ مَیں نے اُسے درس گاہ میں قربانی کے بکروں کی طرح قربان کیے گئے بچے بھی دکھائے جن کے جنازوں پر کھڑے ہو کر کچھ لوگ اپنے قد بڑھانے میں مصروف تھے اور مَیں نے اُسے اور بھی بے شمار لاشیں دکھائیں، چھوٹی چھوٹی لاشیں، چھوٹے چھوٹے تابوت۔۔۔ اور مَیں نے اُسے وہ آدمی بھی دکھائے جن کا انسانوں کی نسل سے کوئی تعلق نہیں اگرچہ وُہ انسانوں جیسے نظر آتے ہیں اور مَیں نے اُس سے پوچھا کہ یہ پاگل پن کس کی دین ہے؟

''میری تو نہیں۔''

''تو کیا؟ تم یہ سب ختم تو کر سکتے ہو۔''

وہ منہ سے کچھ نہ بولا تو مَیں نے اُسے اُکسانے کے لیے ایک دو سالہ بچہ دکھایا جو اپنے والد کے ساتھ بھرے بازار میں کھڑی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا اور من پسند کھلونا ملنے کے خیال سے اُس کا چہرہ چمک رہا تھا مگر ایک طرف سے وہ انسان آئے جن کا انسانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ مَیں نے اُسے گولیاں چلانے والوں کے منہ سے نکلتے نعرے سنوائے اور مَیں نے اُسے تین گولیاں کھانے والے دو سالہ بچے کے بازو پر بندھا امام ضامن بھی دکھایا۔ مَیں نے اسے دس سالہ بچی سرِ بازار سرتاپا برہنہ دکھائی جس نے مالک زادے کا فرمان نہیں مانا تھا اور میں نے اُسے ایک آٹھ سالہ بچہ بھی بل کھاتی پگڈنڈیوں پر گھسٹتا ہوا دکھایا جسے گدھے کے پیچھے باندھا گیا تھا جس نے مکئی کا ایک بھٹا توڑنے کا گناہِ کبیرہ کیا تھا اور عبرت

ناک سزائے موت پائی۔

مَیں نے اُسے اُس بچے کی لاش بھی دکھائی جو ماں کے پیٹ میں تھا اور اُس کی ماں کو نہ ناچنے پر گولی ماردی گئی تھی جو بچے کے دل کو جا لگی تھی۔ وُہ بھاگ سڑی مرتے مرتے بھی باجا بجانے والے جیون ساتھی کی بچت کر گئی کہ اُسے دو قبروں کے پیسے نہیں دینے پڑے۔ مَیں نے اُسے یہ بھی دکھایا کہ گائیکہ کی لاش تھانے پڑی ہے مگر پرچہ نہیں کٹا۔ لاش ایس پی کے دروازے پر پڑی ہے مگر پرچہ نہیں کٹا۔ لاش پریس کلب پہنچی تو پرچہ کٹا۔ یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ کوئی مسئلہ تب تک مسئلہ نہیں سمجھا جاتا جب تک میڈیا اسے مسئلہ بنا نہ دے اور جب میڈیا نے مسئلہ بنایا تو گولی چلانے والا پکڑا گیا اور مَیں نے اُس کی شکل پر صاف صاف لکھا دکھایا کہ وہ پہلے بھی انسانوں پر گولی چلا چکا ہے اور مَیں نے اُسے یہ بھی دکھایا کہ گولی چلوانے والا سؤر آرام سے قاضی کی منشی گیری کرتا رہا اور مَیں نے یہ پیشگوئی بھی کر دی کہ سلاخوں کے پیچھے نظر آنے والا مکروہ چہرہ کسی بھی وقت سلاخوں کے سامنے فتح کا نشان بنائے مسکراتا دکھائی دے گا۔ اُس نے میری پیشین گوئی پوری ہونے نہ ہونے کے متعلق کچھ نہ کہا تو مَیں نے زہر خند مسکراہٹ پیش کرتے ہوئے وہ لوگ دکھائے جو کہہ رہے تھے کہ صبر کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ دیکھ کر وہ ضرور بولے گا جیسے مجھے یقین تھا کہ وہ نعرے سن کر بولے گا مگر وہ خاموش رہا، ایک لفظ تک نہ بولا، بس میری طرف انگلی اٹھائی، افسوس میں اُس کا اشارہ ٹھیک ٹھیک سمجھ نہ پایا اور یوں مَیں اور بھی جھنجھلا گیا۔

ایک وقت آتا ہے جب کچھ بھی ٹھیک ٹھیک یاد نہیں رہتا اگر چہ کچھ نہ کچھ ہمیشہ یاد رہتا ہے سو مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں کہ مَیں اُسے اور کیا کیا کہتا رہا مگر یہ ٹھیک ٹھیک یاد ہے کہ وُہ خاموش رہا اور پھر میں نے بھی چُپ تان لی اور یہ چپ اتنی گہری اور لمبی ہوئی کہ ہر سُو چپ ہی چُپ رہ گئی۔ اسی چپ میں مَیں گم ہو گیا اور وہ بھی اور وہ سارے بچے بھی جو دیکھے اور دکھائے مگر قہوہ خانے کی دہلیز پر ٹھنڈی ہوا کے سراب میں ایک اور گٹھڑی بنا بچہ خواب دیکھ رہا تھا۔

اکتیس مئی دو ہزار اٹھارہ عیسوی

دس ضرب دو برابر صفر

لاہور کے شمال میں ایک پرانی بستی ہے جس کی ایک تنگ اور بند گلی میں موجود اکلوتے کمرے کے مکان میں بلو کرائے پر رہتی تھی۔

اِس شہر کی ٹیڑھی میڑھی تنگ گلیاں اندر سے بڑی کھلی ہوتی تھیں اور دل بھی کشادہ ہوتے تھے۔ پھر کُھلی گلیوں اور تنگ دِلوں کا زمانہ آ گیا لیکن چھوٹی گلیاں اور بڑے دل اب بھی مل جاتے ہیں۔ اکثریت کو یہ تنگ گلیاں بھیڑ بکریوں کا باڑہ نظر آتی ہیں اور چند اِن میں زندگی کا سمندر موج در موج اُچھلتا کودتا دیکھتے ہیں جو ساحل کو ڈبوتا آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ شہر اب شہر نہیں رہا، انسانوں کا جنگل بن چکا ہے جہاں بچے زیادہ دیر بچے نہیں رہتے۔

بلو کے بچے بھی تیزی سے بڑے ہو رہے تھے۔ ایک چھ سات سال کا بیٹا اور نو دس سال کی ایک ہی بیٹی تھی۔ وہ خود سارا دن گھر سے غائب رہتی۔ اُس کی بچی اکثر ہاتھ میں کٹورہ پکڑے ایک گھر جاتی۔ بچہ چنگیر پکڑے دوسرا دروازہ کھٹکھٹاتا اور یوں ماں کی عدم موجودگی میں اپنے لیے خوراک مہیا کر لیتے۔

اُس کا نام معلوم نہیں اور یہ بھی خبر نہیں کہ وہ سارے محلے میں بلو کیوں مشہور تھی؟ شریر بچے اسے بلی بھی پکارتے لیکن پیٹھ پیچھے۔۔۔ اور بچوں کے باپ اسے پتا نہیں کیا کیا کہتے تھے مگر جب وہ سامنے نہ ہوتی۔۔۔ عورتیں بھی کچھ نہ کچھ کہتی رہتی تھیں لیکن زیادہ تر ایسا جو ایک کمرے کے مکان میں کرائے پر رہنے والوں کے متعلق کہا جاتا ہے۔

اُس کی عمر پینتیس سے چالیس کے درمیان ہوگی۔ جغرافیہ بگڑا ہوا البتہ نین نقش صاف صاف بتاتے کہ کبھی بڑی غضب کی ہوگی۔ اب تو اُس کے بال ہمہ وقت اُلجھے اُلجھے اور مٹی سے اَٹے رہتے جن میں میلی انگلیوں کی کٹی پھٹی پوروں کے ساتھ خارش کرتی وہ کبھی کبھی شام کے وقت اپنی دہلیز پر پائی جاتی یا اتوار کے دن دروازے کے ساتھ بنے تھڑے پر بیٹھی بیٹی کی جوئیں نکالتی نظر آتی۔ کپڑے اُس کے پھٹے تو نہ ہوتے لیکن کثرت استعمال سے اُس کی طرح گھسے ضرور ہوتے۔ بلو کے جسم میں ایسی کوئی خاص بات نہیں رہی تھی جس کا ذکر ضروری ہو۔ بس وہ پیچھے سے تھوڑی نمایاں تھی۔ گھر سے باہر قدم نکالتی تو پاؤں سے پہلے پیٹ نظر آتا جس کے بعد سینہ اور پھر منہ دیکھنے کو ملتا۔

بلو زیادہ موٹی تھی نہ اس کا مرد کافی پتلا تھا لیکن عمر پیچھے رہ گئی تھی، جسم آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ اپنے سے دس سال بڑی دکھائی دیتی تھی اور اُس کا مرد اس سے پندرہ سال چھوٹا نظر آتا تھا۔ چہرہ بھی حالات کا واضح عکاس تھا، اُس تختی کی طرح جس پر کسی بچے کی سیاہی سے لتھڑی دو انگلیاں دونوں آنکھوں کے نیچے لگ گئی ہوں مگر بلو کے مرد کا چہرہ اس بلیک بورڈ کی طرح چمکتا تھا جس پر تازہ تازہ سیاہ پینٹ کیا گیا ہو۔

وہ چھوٹی بس کا ڈرائیور تھا اور اِستری کی ہوئی کلف لگی صاف ستھری شلوار قمیص پہنتا تھا۔ موٹر سائیکل اُس کے پاس تھی، جسے وہ چمکا کر اڈے پر جاتا۔ اِس کے بعد بلو بھی گھر سے چلی جاتی۔ پہلے وہ ایک کوٹھی میں برتن دھوتی جہاں اُس کے ناخن تڑخ جاتے اور پوریں بے جان ہو جاتی تھیں۔ کپڑوں کی دھلائی بھی اُس کی ذمہ داری تھی۔ مالکن ہر بار داغ رہ جانے کے لیے ڈانٹتی اور جب بلو صفائی کر رہی ہوتی تو بار بار کہتی۔

''اندھی ہے تُو، نظر نہیں آتا۔ گندگی چھوڑتی جاتی ہے۔ چل دوبارہ جھاڑو لگا۔'' اور وہ چہرے پر پھیلتے ناگواری کے تاثرات پوری ایمانداری سے چھپاتے ہوئے صاف فرش اور صاف کرنے کی کوشش کرتی۔ اس کے بعد وہ دوسری کوٹھی میں بھی یہی کچھ کرتی اور شام کو

اپنے ڈربے میں لوٹ آتی جہاں وہ اپنے بچوں کے ساتھ سمٹی رہتی اور اُس کا مرد کچھ زیادہ ہی پھیلا رہتا۔

بلو کی زندگی ایسی ہی تھی بے زار سی، بے جان سی، زندگی کی حرارت کے بغیر چلتی سانسیں۔۔۔اُس کی جسمانی حالت اور شوہر کے تیور بتاتے تھے کہ اب وہ صرف کھانا پکانے، کپڑے دھونے، جھاڑ پونچھ کرنے اور سونے کے لیے گھر آتی ہے۔وہ سوتی بھی اُس جاپانی روبوٹ کی طرح تھی جس کی بیٹری نکال لی گئی ہو۔بس یہی کچھ تھا جو وہ کرتی تھی یا کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی اور نتیجہ یہ تھا کہ اُس کی کوئی چیز دلچسپ نہیں رہی تھی سوائے اُس کی محرومیوں کی سان پر چڑھی تیکھی زبان کے جو سب کو مزہ دیتی تھی۔

وہ لڑاکا نہیں تھی۔گھر میں ہوتی تو اُس کی موجودگی کا علم تب ہوتا جب گالیاں سنائی دیتیں اور مرد اپنے دروازوں کے کواڑ کھولے بغیر کان کھڑے کر لیتے۔عورتیں منہ میں انگلیاں لے لے کر ایک دوسرے کو اشارے کرتیں۔بلو گالیوں میں بالخصوص اور بات چیت میں بالعموم بڑے مزے دار الفاظ استعمال کرتی تھی۔وہ گلی میں کھڑے کھڑے ایسے اعضا کا ذکر بڑے کھلے ڈھلے انداز میں کر دیتی جو مرد صرف لڑائی میں ایک دوسرے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔محلّہ داروں کے نزدیک وہ گالیاں بہت بکتی تھی لیکن کبھی کسی نے وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔گالیاں دینا ایسے ہی ہے جیسے گٹر سے گندگی نکالنا جو پھنس جائے تو گلیاں بھر جاتی ہیں۔گلی میں کوئی اور عورت بھی غلاظت نکال رہی ہوتی تو وہ ساری مردوں کے اندر چلی جاتی جو اُن سے ہوتی ہوئی بچوں میں داخل ہو جاتی۔

گلی کی نکڑ پر ایک دن کسی سرکاری دفتر میں کلرکی کرنے والے حمید کے دو چھوٹے لڑکے اپنے ماں باپ سے ملی غلاظت اُس وقت نکالنے لگے جب بلو شام کے وقت سارے دن کی تھکی ہاری چنگ چی کا کرایہ بچا کر قدموں پر گھر آ رہی تھی۔

''بلو ڈیڑھ سو......بلو ڈیڑھ سو......''

بلو کے پاؤں وہیں رک گئے۔ اُس نے کانوں کے راستے دل کو راکھ کر دینے والا لاوا اگلنے سے خود کو روکا اور بچوں کو پیار سے سمجھانے لگی لیکن بچے باز نہ آئے اور پھر وہی۔۔۔

''بلو ڈیڑھ سو...... بلو ڈیڑھ سو۔''

اُس نے غصیلے انداز میں سمجھایا تو بچوں نے شور مچا دیا۔۔۔

''بلو دس روپے...... بلو دس روپے۔''

بلو کے لاوے کے آگے لگے غربت کے بند میں شگاف پڑ گیا اور وہ بچوں کے قد سے بڑی گالیاں بکنے لگی جس پر کچھ لوگ دروازوں کی اوٹ میں محظوظ ہونے لگے لیکن حمید دروازے سے باہر آیا، پیچھے اُس کی بیوی تھی جس کے بعد ماں اور پھر تین بھائی نکل آئے۔ وہ سارے بلو کو اُس سے زیادہ موٹی گالیاں دیتے ہوئے پل پڑے۔ مار کٹائی میں اُس کے بوسیدہ کپڑے بھی پھٹ گئے اور ایسی چوٹیں بھی آئیں کہ کسی کو دکھا نہ سکتی تھی۔

حمید اور اُس کے گھر والوں کا پارا اترا تو بلو اپنے اندر باہر سے زخمی وجود کو سہارا دیتی کھڑی ہوئی اور اپنا آپ سہلاتی گلی والوں کی نظروں سے بچتی اپنے آپ کو خود میں چھپاتی ہوئی ڈربے میں پہنچ گئی۔ جب اُس کا گھر والا آیا تو دونوں تھانے گئے اور کارروائی کے لیے درخواست کی جسے چھوٹے منشی نے ٹال مٹول کے بعد بڑی مشکل سے تحریری شکل دی۔

دوسرے دن جب بلو اور اُس کا گھر والا تھانے میں داخل ہو رہے تھے تو حمید اپنی عورتوں اور کئی محلّہ داروں کے ساتھ نکل رہا تھا۔ بلو اپنے مرد کے ساتھ تھانیدار کے سامنے پیش ہوئی تو اُس نے صاف صاف کہہ دیا۔

''بلو جی! سارے محلے نے تمہارے خلاف گواہی دی ہے۔ صلح کر لو۔''

بلو نے اپنی بپتا سنانے کی کوشش کی تو تھانیدار نے جھاڑ پلاتے ہوئے کہا۔

''صلح کر لو۔ یہی بہتر ہے۔ سب کہتے ہیں تم دو نمبر ہو۔'' بلو تھانیدار کے دس نمبری لہجے پر کھول اٹھی۔ اُسے کمرے میں موجود ہر شے دو نمبر۔۔۔ دو نمبر کی رٹ لگاتی محسوس

ہوئی۔ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور چنگھاڑنے لگی۔

''میں دونمبر نئیں۔ سارا دن پانڈے مانجھ مانجھ کے روٹی کمانی آں۔ دونمبر تے او کنجر جناں مینوں ماریا کٹیا۔۔۔ میرے کپڑے پاڑے تے مینوں گالاں کڈیاں۔۔۔'' بلو بولتی گئی اور اُس کا مرد نظریں نیچی کیے سنتا رہا لیکن تھانیدار چند لمحے ہی سن سکا۔ اُس نے مزید کچھ لمحے بلو کو چپ کرانے کی کوشش کی۔ پھر سپاہیوں کے ذریعے نکال باہر کیا۔

سپاہی جب اُسے بازوؤں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے تھانے سے باہر نکال رہے تھے، وہ یہی کہہ رہی تھی۔

''میں دونمبر نئیں۔ میں مزدوری کرنی آں۔'' اور گھر پہنچ کر بھی وہ یہی کہتی رہی۔

اُس دن کے بعد چند روز بلو کا مرد کم کم نظر آیا اور بلو دونمبری کے کنویں میں ایسی گری کہ بالکل نظر نہ آئی۔ وہ شام کے بجائے رات کو گھر آنے لگی۔ اتوار کے دن بھی بیٹی کی جوئیں نکالتی نظر نہ آتی۔ جب گھر ہوتی تو اپنی طرح جھکی ہوئی چارپائی پر لیٹی رہتی، کھانا پکاتی یا بچوں کے کپڑے دھوتی۔ اُس کی غیر موجودگی میں بچے سرکاری سکول سے واپس آ کر یونہی اِدھر اُدھر سے روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرتے اور تھڑے پر بیٹھے گالی گالی کھیلتے رہتے۔

بلو کی پٹائی کو جب ایک مہینہ ہو گیا تو اُس کا مرد دن چڑھے بال بنائے دروازے میں کھڑا نظر آنے لگا۔ وہ پرانے دنوں کی طرح موٹر سائیکل چمکاتا اور غائب ہو جاتا۔ پھر ایک دن ایسا گیا کہ واپس نہ آیا۔ بس ایک لفافہ آیا جس میں موجود کاغذ ڈاکیے نے پڑھ کر سنایا تو بلو چپ چاپ دروازہ بند کر کے چارپائی پر جا لیٹی اور کچھ دیر آنسو بہانے کے بعد ہزیانی کیفیت میں گالیاں بکنے لگی جو بند دروازہ چیرتی ہوئی گلی میں گونجتی رہیں۔ گالیوں کے درمیان وقفہ بھی آ جاتا۔

''میں دونمبر نئیں۔۔۔ دونمبر تھانیدار۔۔۔ دونمبر محلے دار۔۔۔ دونمبر میدا کنجر۔۔۔ وڈے آئے اک نمبر۔۔۔ میں دونمبر آں تے تسی دس نمبر او کنجرو۔۔۔'' اور پھر ماں بہن کی

گالیاں شروع ہو جاتیں۔ کچھ محلے دار اپنے بیرونی دروازوں کے اندر اور چند باہر کھڑے مستور اعضا کے غیر مستور اظہار پر وجہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند ایک مغلظات کو دل پر لے رہے تھے اور بہتوں کا دھیان صرف چٹخارے پر تھا جبکہ مزے دار گالیاں بے مزہ ہو چکی تھیں۔ یہ بدمزگی بلو کی بچی اور بچے کے چہروں پر بھی نمایاں ہو گئی تھی جو تھڑے پر، انجانے خوف میں مبتلا، ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

تین اپریل دو ہزار پندرہ عیسوی

خوش بخت نوحہ

''یہ افسانہ ذکاء الرحمٰن کی نذر رہے (ذ ر) سے مراد ذکاء الرحمٰن کے افسانوں کے اقتباسات ہیں''

حرف کی حرمت میں کندن ہوا لفظ ساز میرے سامنے صوفے پر بیٹھا ہے۔ رنگ گندمی، قد بوٹا، بال خضاب سے سیاہ اور چمکدار، دو رنگی مونچھیں، استرا رگڑ رگڑ کی ہوئی شیو، نیلاہٹ میں ڈوبی کالی شلوار قمیص اور اسی رنگ کی ویسٹ کوٹ پہن رکھی ہے۔ نئے ڈیزائن کا نفیس چشمہ ناک پر ٹِکا ہے۔ پتلی پتلی انگلیوں والے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں سے بائیں میں چند کاغذ ہیں، دائیں میں سگریٹ سُلگ رہا ہے اور زبان نوحہ گُناں ہے۔

''ہم اپنے لاشریک کی ناقابلِ برداشت بوجھ والی فقہ تلے سانس کے معنوں میں تو زندہ رہتے ہیں لیکن اعتبارِ زندگی کے حساب سے زندہ نہیں رہتے۔ ہمارے لیے متبادلات اور مترادفات لایعنی ہو جاتے ہیں۔ لاشریک کے خوشامدی مشیر گداز صوفوں میں دھنس کر اپنی فقہی اِصطلاحات اور اِصلاحات پر خوشگوار تبصرے کرتے ہیں اور اپنے لاشریک کی توصیف کرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ موسیقار پرندے ہمارے شہر سے ہجرت کر چکے ہیں اور ہمارے باغوں کے رقاص مور کہیں اور جا بسے ہیں اور ہمارے خواب اور ہمارے آدرش معنوں سے خالی ہو چکے ہیں اور ہمارے ہونے کے تمام مفہوم یوں نچوڑ لیے گئے ہیں جیسے سخت انگلیاں لیموں نچوڑ لیتی ہیں۔'' (ذ ر)

نوحہ گروَلی کا جوش سے اُوپر اُٹھتا اور نیچے جھکتا دایاں ہاتھ جس میں سگریٹ سُلگ

سُلگ کرانگلیاں جلانے کو ہے، ایش ٹرے کی طرف بڑھتا ہے اور وہ واہ واہ کی صدائیں دینے والے چہروں کی طرف دیکھتا ہے۔ایک کونے میں صوفے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا اداس بوڑھا شاعر اپنے پاؤں کی اُنگلیوں میں خلال کرتے ہوئے درد کی موٹی تہہ نکالنے کی کوشش کررہا ہے۔اُس کی بائیں طرف صوفے پرایک داڑھی مُنڈا نوجوان شاعر ہے جس کی بغل میں اُس کا ایک اَن پڑھ دوست ہے جو جیل کو دوسرا گھر قرار دیتا ہے اور کُھلے پنجرے سے تنگ آ کر بصد شوق قید خانے میں گہری سانس لینے اکثر جاتا ہے۔اُداس بوڑھے شاعر کی دائیں طرف صوفے پر گھنی داڑھی والا شاعر چھت سے لٹک رہے فانوس کی لڑیاں گن رہا ہے،اس کے ساتھ بیٹھا کہانی کار ٹوپی سے ماتھا چھپائے آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہا ہے لیکن مَیں طلسماتی حقیقت نگار کے دوبارہ سحر پھونکنے کا منتظر ہوں۔

''اے مہربان اور محنت کرنے والی ماں! اپنے بیٹوں جیسے ایک مسافر کی طرف سے یہ چھوٹا سا تحفہ قبول کر کہ تیرے بیٹوں جیسے اس مسافر کا پیشہ خوبصورت اور مقدس ناموں کو خوبصورت اور مقدس طریقے سے لکھنا ہے اور اس نے تیرے لیے اس تختی پر ایک بہت ہی خوبصورت اور پاک نام کا نقش کوئلے سے بنایا ہے۔۔۔تُو نے اگر اپنے بیٹوں جیسے اِس مسافر کو اپنی بے زبان دعاؤں میں یاد رکھا اور خدا نے تیرے بیٹوں جیسے اس مسافر کے دِن طویل کر دیے اور رنگوں اور کُوچیوں اور بُرشوں کے استعمال میں طاقت عطا کر دی تو مَیں اس خوبصورت اور پاک نام میں رنگ بھرنے ضرور لوٹ کر آؤں گا۔۔۔ضرور لوٹ کر آؤں گا۔'' (ذر)

وہ توقف کرتا ہے کہ ایک خاتون پلاسٹک کی ٹرے میں مشروب سے بھرا جگ اور گلاس رکھے کمرے میں داخل ہوتی ہے اور لمبے بالوں والے بوڑھے شاعر، داڑھی والے شاعر، داڑھی کے بغیر شاعر اور کہانی کار اور مجھ محنت کار کو ایک ایک گلاس دیتی ہے۔ہم

شربت پینے لگتے ہیں، وہ سگریٹ سُلگا کر کبھی پچھلا ورق اُلٹا تا ہے، کبھی اَگلا سامنے لاتا ہے اور جب مطلوبہ صفحہ پالیتا ہے تو ہماری موجودگی کو نگاہوں میں تولتے ہوئے توجہ طلب کرتا ہے اور ایک لمبا کش لے کر دھوئیں میں لپیٹ کر لفظ اُگلتا ہے۔

''میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا، شاہراہ پر آجاتا ہوں اور اپنے زخموں کے ساتھ محوِ سفر ہو جاتا ہوں، محوِ ہجرت ہو جاتا ہوں۔ لیکن اب یہ شاہراہ مجھے خوفزدہ نہیں کرے گی اور غمگین نہیں کرے گی اور اُداس نہیں کرے گی۔ میری جینز پر چپکے ہوئے اَوہام کے اور تہی خوابی کے اور بے خبری کے تنکے جھڑ چکے ہیں۔ اب میرے پاس خواب بھی ہے اور خبر بھی ہے۔ میں تیس نوٹوں کو چلانے کی توانائی لینے جا رہا ہوں۔ اچھا ہوا تھا کہ سیاہ مرسیڈیز میں بیٹھی ہوئی فرعون ممی نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا تھا ورنہ اس وقت مَیں اپنے زخموں کو اپنے بدن پر اٹھائے اس شاہراہ پر اپنے خواب اور اپنی خبر کے ساتھ نہ چل رہا ہوتا۔'' (ذر)

وہ سانس لیتا ہے اور بات برقرار رکھتا ہے۔

''حُرف کہ رنگ اور نسل کا ہر امتیاز مٹا دیا گیا، حُرف کہ محنت کے بغیر سرمائے میں اضافہ کرنے کا حق ختم کر دیا گیا، حُرف کہ فضیلت کے جھوٹے معیار پاؤں تلے روند دیے گئے۔۔۔'' (ذر)

اور میں اسے ٹوکتا ہوں کہ کہہ سکوں۔۔۔ کہہ سکوں کہ ہاں یہی وہ بات ہے جو میں سننا چاہتا ہوں۔ یہی وہ بات ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ مَیں محنت کار بھی بطور انسان اُتنا ہی واجب الاحترام ہوں جتنا کہ کوئی عالی شان ہوتا ہے کیونکہ میں انسان ہوں۔ اور جب میں انسان کی جون میں جنمایا گیا ہوں تو میں وہ احترام پیدائش کے ساتھ لایا ہوں جو کوئی نہیں چھین سکتا۔ یہ مجھے اُس نے دیا ہے جس نے تمہیں عقل دی تا کہ تم اسے استعمال کر سکو۔ جس نے تمہیں اِتنی بڑی دنیا دی کہ تم اس سے استفادہ کر سکو۔ ٹھیرو۔ مجھے پوچھنے دو، کیا اُس نے

تمہیں اِسے پامال کرنے کا حق بھی دیا ہے؟ جیسے وہ، جو خودساختہ عالی شان ہیں، سمجھتے ہیں کہ اُنہیں مجھے پامال کرنے کا حق دیا گیا ہے، فرض بھی کیا گیا ہے کہ مجھے ٹاٹ پر بٹھائیں اور خود تپتی دوپہروں میں ٹھنڈے کمروں میں پڑے گدازصوفوں میں دھنسے میرے متعلق فیصلے سنائیں کہ وہ محنت کار جو ہم میں سے نہیں، ان پر واجب ہے کہ وہ محنت کار ہی رہیں تا کہ ہم پھل کھاتے رہیں۔

حاضرین میری طرف عجب نظروں سے دیکھتے ہیں لیکن مجھے کسی کی پروانہیں کیونکہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور مجھے حق ہے کہ میں کچھ کہوں کیوں کہ اس نے مجھے زبان دی ہے جس نے مجھے احترام دیا ہے تو میں بولوں گا کیونکہ اس نے مجھے زبان چلانے والی مشینری سے بھی نوازا ہے جو میری کھوپڑی کے اندر فٹ کی گئی ہے اور وہ مجھے حکم دے رہی ہے۔

اے نوحہ گروَلی! تم نے ابھی اُس کے بول بولے ہیں کہ تم سب برابر ہو کیونکہ تم سب انسان ہو۔ لیکن ایک بات بتاؤ کہ مجھے سب برابر کیوں نظر نہیں آتے؟ وہ کہتا ہے کہ عالم اور جاہل برابر نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ وہ برابر نہیں لیکن میری آنکھیں تو کچھ اور ہی دیکھتی ہیں۔ جاہل اِتنے بڑھ چکے ہیں، اِتنے بڑھ چکے ہیں کہ تم جو خود کو ریاضی دان بھی سمجھتے ہو، جاہلوں کی گنتی نہیں کر سکتے اور مزے کی بات بتاؤں؟ اب جاہل واقعی برابر نہیں، وہ افضل ہو چکے ہیں اور تم جو خود کو عالم سمجھتے ہو، منہ چھپاتے پھرتے ہو۔ گوشہ نشیں لفظ ساز بن چکے ہو مگر تمہارے لفظ۔۔۔ آہ لفظ کی حرمت پامال ہو رہی ہے۔ ہر سچے لفظ کی حرمت پامال ہو رہی ہے۔

میری آہوں کا طوفان ذرا ٹھیر جاتا ہے تو سب سکون کا سانس لیتے ہیں سوائے نوحہ گر وَلی کے اور اس کی مجوّف عدسوں کے پیچھے دانش سے چمکتی آنکھیں مجھے یوں گھور رہی ہیں جیسے کہہ رہی ہوں۔۔۔ چُپ کیوں ہو گئے۔۔۔ بہہ جانے دو۔۔۔ اور میں اِردگرد نظر

دوڑاتا ہوں اور یوں گویا ہوتا ہوں جیسے خطبہ دے رہا ہوں اور میرے الفاظ یوں برس رہے ہیں جیسے دسمبر میں بادل گرجتے ہیں۔

تُم اُس جاہل کو دیکھو جو ہمارے سروں پر اپنی جہالت اور ہماری خجالت کے سبب سوار ہے اور اُسے بھی دیکھو جس نے بھاری قدموں کے ساتھ ہمارے کندھے جُھکا دیے ہیں۔ ان سب کو دیکھو جو ہماری کھوپڑیوں میں اپنی سیاہ سوچیں بھرتے ہیں اور ہماری سچی سوچیں ہماری کھوپڑیوں کے کونوں میں پناہ لیتی ہیں اور وہاں سے کبھی کبھی ہاتھ نکال کر ہمیں خارش کرتی ہیں تاکہ ہم خارجی اور قابض سوچوں کو پرے دھکیل کر اپنوں کے لیے جگہ خالی کریں۔ لیکن ہم کس کس کو بھگائیں؟ مغرب سے حملہ آور یا مشرق سے ورثے میں ملیں، شمال سے آئیں یا جنوب کی گھس بیٹھ کرنے والی، اُوپر سے اُتری یا نیچے سے آہنی کیلوں سے لیس ڈنڈوں کے ساتھ دھکیلی گئیں؟

کیا تمہیں یاد ہے وہ زمانہ جب لوگ اس لیے مشقت نہیں کرتے تھے کہ نوٹ اکٹھے کر سکیں۔ وہ اس لیے پسینہ بہاتے تھے کہ اپنی اور دوسروں کی ضرورت پوری کر سکیں۔ وہ کسی کے خون سے اپنے لیے برانڈی کشید نہیں کرتے تھے اور وہ کسی کے کھیت سے آلو چرا کر واڈکا بھی نہیں بناتے تھے۔ وہ گندم اُگاتے تھے تاکہ آپ کھا سکیں اور پڑوسی کو دے کر چاول لے سکیں یعنی کہ ہر دو کو نعمتیں میسر ہو جائیں۔ اے میرے نوحہ گر! تُو ایک نوحہ یہ بھی کر کہ ہر نعمت پامال ہو رہی ہے جیسے مجھ محنت کار کی عزت اور محنت ہڑپ ہو رہی ہے۔

وہ ترنگ میں آتا ہے اور کہتا ہے سنو۔۔۔ اور مَیں سنتا ہوں۔ تُم بھی سنو۔

"یہ گاؤں جو تُم دیکھ رہے ہو، ان میں زندگی کی ویرانی اور تنہائی نہیں ہے۔ بے انقلابیت کی ویرانی اور تنہائی ہے۔ یہ موت کے نگر ہیں اور ان کے کھیتوں میں اِلوہی جوہر سے اُبھرنے والے وجود کی عِصمت داغدار ہوتی ہے۔ موت سے اور عِصمت کی داغ داری

سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ جُگنی گاؤ۔۔۔زبان سے نہ گا سکوتو انگلیوں سے گاؤ۔۔۔!

جُگنی میری بھنگڑا پاوے، نال نبیؐ دا حکم سناوے، جیہڑا وائے اُوہی کھاوے، مالک نہ کوئی ہور سَدا وے۔۔۔"(ذر)

وہ خاموش ہوتا ہے تو میں بے ساختہ کہتا ہوں کہ تمہارے بول سچے ہیں۔اب میری ایک سچی بات بھی سن لو۔کیا تُم کالے اور گورے، بھورے اور پیلے، لال اور گلابی حیلہ گروں کی حیلہ جوئی سے واقف ہو جو دِکھاتے سچی اور مارتے کھبی ہیں۔وہ تمہاری کُل کمائی لوٹ لیتے ہیں اور بدلے میں تمہیں فلاح کی نوید سناتے ہیں مگر وہ فلاح کہ جس کے انتظار میں میری جوان آنکھیں بوڑھی ہوگئی ہیں اور میرے مضبوط بازو کمزور پڑ گئے ہیں، میری جان دار ٹانگیں بے جان ہیں اور میری رگوں میں دوڑتا گرم خون جمنے لگا ہے، آہ۔۔۔وہ فلاح پامال ہو رہی ہے۔

وہ بوڑھا مجھے نوحہ گر قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمہاری نوحہ گری میں یوں شامل ہوتا ہوں۔۔۔

"مَیں بھی اِسی شہر کا رہنے والا ہوں اور شِرک کرتا ہوں، خود ساختہ لاشریکوں کے سامنے شِرک کرتا ہوں۔۔۔یاہُو میں مشرک ہوں اور میرا مکہ سُرخ گلاب ہے اور میری جائے نماز بہتی ندی ہے اور میرا سنگِ اسود روشنی ہے اور میری دعا نوخیز کلی کی چٹک ہے اور میری عبادت مٹی کی زرخیزی ہے اور میری جنت گندم کی جھومتی پکی فصل ہے۔۔۔میں صبح کی بارش سے وضو کر کے مناجات کرتا ہوں تو میرے باطن میں چاند خرام کرتا ہے۔نشیلی ہوا درختوں کے مناروں پر سرخوشی کی اذان دیتی ہے تو مَیں پھولوں کے مصلوں پر نماز پڑھتا ہوں۔میرا کعبہ آزادی ہے اور میری آزادی کوچہ کوچہ گلی گلی خوشبو سفر کرتی ہے اور دلوں اور

ذہنوں میں اور باغوں میں دیوانہ وار پھیلتی ہے۔'' (ذر)

اے مُنّے سے وجود میں دھڑ کتے بڑے سے دل کے مالک! تیرے شاعرانہ اعتراف میں اور تیرے مفکرانہ انکشاف میں عجب جذب و مستی ہے کہ مَیں خودی اور بے خودی کی سبز پٹیوں کے ٹھیک درمیان بہتے دریا میں مسرّت، حیرت اور بصیرت کی کشتی پر سوار ہو جاتا ہوں مگر تیرا بلند آہنگ نغمہ مجھے لفظ کی حرمت پامال ہونے کی یاد دلاتا ہے۔ آہ۔۔۔ لفظ کی حرمت پامال ہو رہی ہے اور لفظ صرف لفظ نہیں ہوتا، ایک جہان ہوتا ہے۔ آہ۔۔۔ میرا جہان پامال ہو رہا ہے۔ تیرا جہان پامال ہو رہا ہے۔ ہر جہان پامال ہو رہا ہے۔ اے جہاندیدہ بزرگ! جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ طمع سے پاک جہاندیدگی چھین لی گئی ہے اور اس کی جگہ مکاری نے لے لی ہے جو بے حد بُری بلا ہے جو سارے کا سارا لپیٹ لیتی ہے اور سوچوں کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اڑا دیتی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ ذرے کہیں دُور ایک جگہ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ بخارات بھی ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں اور زمین پر برستے ہیں۔

وہ صوفے سے اُٹھتا ہے، میری طرف بڑھتا ہے، میں بھی کھڑا ہوتا ہوں اور وہ مجھ سے بغل گیر ہو جاتا ہے۔ وہ میرے کندھے پر تھپکیاں دے کر واپس اپنی جگہ جا بیٹھتا ہے اور دائیں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ جو ابھی آدھا ہوا ہے، ایش ٹرے میں بُجھا دیتا ہے۔ وہ حاضرین کی طرف دیکھ رہا ہے اور حاضرین میری جانب ۔۔۔ اور میں ان سب کو ۔۔۔ چُپ چاپ۔۔۔ کوئی آواز کانوں کو سنائی نہیں دے رہی گو صدائیں ہیں اور برابر اٹھ رہی ہیں مگر سنائی نہیں دے رہیں۔

چند منٹ یونہی گزر جاتے ہیں۔ کمرہ خاموشی کے لیے چھوٹا پڑ جاتا ہے اور نوحہ گر وَلی اس سناٹے کا حصار توڑنے کے لیے پہل کرتا ہے۔

''اب صرف ایک ہی چارۂ کار باقی رہ گیا ہے کہ اِس بے ستارہ اور بے چاند رات

میں منظر منظر اور چہرہ چہرہ تقسیم شدہ خود کو جمع کروں اور اِس جمع کمائی سے فلوریسنٹ لائٹس کے انگاروں پر لیٹی ہوئی اس رات کو آزاد کراؤں تا کہ اِس کے حلق سے سچائی کے اعلان کا مترنم چاند طلوع ہو اور اس کے کالے بالوں میں ستارے اتر آئیں۔'' (ذر)

وہ خاموش ہوتا ہے تو لمبے کالے بالوں والا بوڑھا شاعر یوں داد دیتا ہے۔۔۔میاں تُم تو تاریخ کا حصہ ہو گئے۔۔۔اس جملے کے جادو سے نوحہ گر کا جوش اور بڑھ جاتا ہے۔

''ایسی کوئی شے وجود نہیں رکھتی جس کا نام قید ہو، جس کا نام جبر ہو، جس کا نام اقتدار ہو، جس کا نام قتل ہو، جس کا نام موت ہو اور ایسی کوئی شے وجود نہیں رکھتی جس کا نام تخلیق ہو اور جس کا نام زندگی ہو۔ اصطلاحیں ہمیشہ ویسی ہوتی ہیں جیسی تم انھیں بناتے ہو اور اصطلاحیں ایک خود کار عمل کے مختلف مرحلے ہیں اور اس خود کار عمل کے چند مرحلوں سے الجھنا اس عمل کے آخری نتائج کو تبدیل نہیں کر سکتا۔'' (ذر)

داڑھی منڈا شاعر اور داڑھی والا شاعر یک زبان ہو کر سراہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچھ اور بھی سنایئے۔ تقلید میں ہم سب کہتے ہیں کہ کچھ اور بھی سنایئے۔

''تُم وہ ہو، جو تُم ہو۔ ایسا کوئی دیوتا موجود نہیں ہے جو تمہاری تحسین سمیٹ سکے اور تمہارا الزام اوڑھ سکے۔ اپنے اعمال کے ساتھ صرف تم کھڑے ہو سکتے ہو۔ کہہ دو کہ تُم ہی سب کچھ ہو۔ کہہ دو کہ تُم ہی ازل ہو اور تُم ہی ابد ہو۔ کہہ دو کہ تُم اپنے علاوہ سب سے انکار کرتے ہو، اس لیے کہ پُر یقین انکار بے یقین اقرار سے بڑی ضمانت ہے۔ بے یقین اقرار روکتا ہے اور پُر یقین انکار جاری کرتا ہے۔'' (ذر)

پھر واہ واہ کی تکرار ہوتی ہے لیکن میرے ذہن میں گھڑی کی سوئیاں الٹی گھوم رہی ہیں اور میں سب کو ٹوکتا ہوں اور وہ سب مجھ بد تمیز کو ناگواری سے دیکھتے ہیں۔ میں آدابِ محفل کی دھجیاں یوں اڑاتا ہوں کہ جلتا قمقمہ بجھ جاتا ہے اور گھومتا پنکھا بھی رک جاتا ہے۔ اِس تاریکی

میں نوحہ گر کی آواز ابھرتی ہے جو مجھے کہتی ہے کہ بولو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟ اور میں بولتا ہوں۔

اے گوشہ نشیں لفظ ساز! میں نے تمہاری لکھتیں پڑھی ہیں اور تم سے سنی بھی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم کہانی کہتے ہو نہ افسانہ لکھتے ہو، تم تو باتیں کرتے ہو۔ میری باتیں، اپنی باتیں، سب کی باتیں گو تمہاری باتیں آسانی سے سمجھ نہیں آتیں لیکن جب میرے دماغ میں ہِل جُل تھم جاتی ہے تو تمہاری باتوں کی گرہیں کُھلنا شروع ہوتی ہیں اور مجھے جا پتا ہے کہ تمہاری باتیں اِلہامی کتابوں سے مستعار ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم دیتا ہے کہ تم نے سیاہ اور سفید حروف پڑھے ہیں۔ تم بستی بستی پھرے ہو۔ تم ریل کی پٹڑیوں اور ان سے وابستہ رومانوں کے جانکار ہو۔ تُم فضا میں اڑتے جہازوں سے واقف ہو۔ ریگ زاروں کی ریت کے کئی ذرے، جو تمہارے بالوں میں کبھی گُھسے تھے، وہ اب تک اٹکے ہوئے ہیں۔ تم نے دریاؤں کا پانی چکھا ہے، ٹوبوں کا پانی پیا ہے اور سمندروں کے پانی کے نمکیات اب تک تمہارے وجود پر دھوپ پڑنے سے چمک چمک جاتے ہیں۔ تُم جاگیردار ہو لیکن میں سمجھ نہیں پاتا کہ تُم کیسے جاگیردار ہو جو کسان کو اس کی فصل سے زیادہ جانتا ہے اور تُم کیسے دولت مند ہو جو افلاس اور اس سے جنم لیتے عیبوں کے نخوسیائے محنت کاروں کو اُن کی محنت سے زیادہ مانتے ہو۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ تُم مجھے چودہ سو سال پرانی باتیں سناتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اِنہی باتوں میں وہ بات ہے جو بھلائی کی بات ہے، جو نجات کی بات ہے، جو آزادی کی بات ہے لیکن کیا تم جانتے ہو کہ آزادی کی قیمت بہت بھاری ہوتی ہے؟

میں سانس لینے کو رُکتا ہوں اور اندھیرے میں اِرد گرد دیکھتا ہوں۔ مجھے تاریکی کے باوجود متجسس چہرے نظر آرہے ہیں جن کے کانوں کے پردوں میں جُنبش ہو رہی ہے اور میں انھیں زیادہ دیر ترسا نہیں سکتا کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ان کا تجسس غارت نہ ہو جائے تو گویا ہوتا ہوں۔

اے نوحہ گرولی! کیوں نہ آج مَیں تمھیں ایک ایسا نوحہ پیش کروں جو میرے دل پر کسی نے نہیں لکھا اور مجھے معلوم بھی نہیں کہ یہ کہاں سے نمودار ہوا ہے۔ میرا ایک بیٹا کسان ہے۔ میرا ایک بیٹا مزدور ہے۔ میرا ایک بیٹا ہنر مند ہے اور میری ایک بیٹی دانش ہے جبکہ میں محنت کار ہوں اور قلم کار بھی ہوں جو تُو بھی ہے اور تُم سب ہو جبھی تیرے سامنے اور تُم سب کے سامنے نوحہ گری کرتا ہوں کہ میں اپنے بیٹوں اور بیٹی کے ماضی سے پریشان ہوں۔ حال سے پریشان ہوں اور مستقبل کے متعلق بھی پریشان ہوں۔

تُم جاننا چاہتے ہو کہ ایسا کیوں ہے؟ میں دِکھاتا ہوں۔ تینوں آنکھیں کھولو اور دیکھو۔ کیا تمھیں نظر آیا میرا وہ کسان بیٹا جس کے کھیت میں ہوا کے زور پر پڑوس سے کچھ بیج آ گرے تھے۔ اس کی زمین بڑی زرخیز تھی اور نم بھی تھی۔ جب فصل پک کر تیار ہوئی تو وہ حیران رہ گیا کہ یہ کھیتی کیسی ہے جو اُس نے بوئی ہی نہیں لیکن اِس کے تحیر پر جلد تغیر آن پہنچا کہ پڑوسی نے اپنے کھیت جیسے روئی کے گولے دیکھ لیے اور اس کثیر الملکی کمپنی کو خبر کی جس سے وہ بیج خریدتا تھا۔ پھر جانتے ہو کیا ہوا؟۔۔۔ میرے اس کسان کی ساری فصل لائی لگ منصف نے کمپنی کے نام کر دی۔

مَیں ایک آہ بھرتا ہوں اور سب آہ بھرتے ہیں مگر مَیں بات آگے بڑھاتا ہوں۔

تمھیں میرے دل پر ثبت وہ سانحہ نظر آتا ہے کہ ایک کارخانہ دار نے میرے ساٹھ ہزار مزدور، میرے ساٹھ ہزار ہنر مند ایک دن میں نکال باہر کیے اور ان کی جگہ آہنی مشینوں کو دے دی جو چوبیس گھنٹے کام کرتی ہیں اور دولت کے ڈھیر لگاتی ہیں۔ اگر تم میرے سینے پر مونگ دلتی ان مشینوں کو دیکھ چکے ہو تو میرے ساٹھ ہزار محنت کار بھی دیکھ لو جن کے گھر درے ہاتھوں میں چھلنی کشکول ہیں اور وہ ننگے پیر تپتی سڑک پر لنگڑا رہے ہیں اور ان کے چہرے دیکھو جن پر کبھی چمک ہوا کرتی تھی جو ساری کی ساری ایک شخص کے تھوبڑے پر

آ گئی ہے۔

اور اے میرے دوست! تُو ذرا میری بیٹی دانش کی طرف دیکھ اور اس کے گرد لپٹا فریب کا لبادہ بھی دیکھ۔ مَیں اُس کا باپ ہوں اور اُسے پہچان نہیں پاتا۔ میں جان نہیں پاتا کہ اُس نے کیسا لباس زیبِ تن کیا ہے؟ کیا وہ واقعی اُس کا ہے یا اغیار نے دیا ہے؟ اور اُس کا خوبصورت چہرہ مرکب سفوف کی اَن گِنت پرتوں میں چھپا ہوا ہے۔ مَیں ایک پرت اتارتا ہوں۔ دوسری اتارتا ہوں۔ تیسری اتارتا ہوں۔ اتارتا جاتا ہوں مگر یہ ختم ہی نہیں ہوتیں۔ مَیں اس کا اصلی روپ دیکھنے کے لیے بے تاب ہوں۔ تُم جانتے ہو، اس سے بڑا دکھ کیا ہوگا کہ تمہاری اولاد تمہارے سامنے اجنبی ہو جائے۔

مَیں خاموش ہو جاتا ہوں کہ درد نے میرا گلا خشک کر دیا ہے لیکن چند لمحے ہی گزرتے ہیں کہ میرے سامعین ہمدردی اور غمگساری کے گیہوں سے میرا حلق تر کر دیتے ہیں اور الفاظ پھسل پھسل کر باہر آتے ہیں۔

اے میرے قلم کار! تُم تاریخ کے ساتھ مباشرت کرتے ہو اور تُم تمام علوم کے ساتھ جماع کرتے ہو اور جو اولاد پیدا ہوتی ہے، وہ سچ ہے۔ میری بات ذرا دھیان سے سنو اور آج ایک سچ مجھے بھی دو کہ میرے کان سچ سننے کو ترستے ہیں۔

کیا تمھیں یاد ہیں میرے وہ مزدور اور ہنر مند بیٹے جن کا خون چوسا جا رہا تھا اور ایک دن ان کی برداشت کا دھاگا ٹوٹ گیا اور انھوں نے خون چوس کیڑوں کے سر اپنی ٹوٹی جوتیوں کے گھسے تلوؤں تلے مسل دیے۔ آہ۔۔۔ ایک وقت آیا کہ وہ خود خون چوس کیڑے بن گئے۔ اور کیا تمھیں وہ دن یاد ہیں جب کھیت جاگے تھے، جب شب کی کچلی حسرتوں اور صبحِ نو کی آرزوؤں نے زمین شق کر دی تھی، تب خون کے چشمے پھوٹے تھے۔ آہ۔۔۔ وہاں سے لہو اب تک اُبل رہا ہے اور یہ میرے بیٹوں کا ہے جن کے کارنامے حیلہ گروں نے ہائی

جیک کر لیے اور تجھ سے نوحہ گر اب تک آنسوؤں میں قلم ڈبو ڈبو کر ورقے گیلے کرتے ہیں۔ آہ۔۔۔ یہ ورقے جلدی جلدی سوکھ جاتے ہیں۔ اے میرے نوحہ گر! میرے اُن بیٹوں کے لیے بھی نوحہ کر جو زرداروں کے سونے اور چاندی کے زہر میں لپٹے تاروں سے بندھے ہیں۔ اور مجھے بتا اب میرے کسان، مزدور اور ہنرمند کیا کریں؟ وہ دو تین حربے آزما چکے ہیں اور نتیجہ وہی نکلا ہے۔ کسی نے کان اِدھر سے پکڑا، کسی نے اُدھر سے۔۔۔ وہ ریچھ کے پنجوں اور بیل کے سینگوں سے خوفزدہ ہیں۔ بتا، اب وہ کیا کریں؟

خود ساختہ لاشریکوں کے سامنے شرک کرنے والا بولا۔

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ پھر بھی سنو۔ اپنے بیٹوں سے کہو سچ تلاش کریں۔ وہی سچ جو تم جانتے ہو، جو میں مانتا ہوں۔''

''وہ کون سا سچ ہے جس کی تُم بات کر رہے ہو۔ میرے سامنے تو سچ کی لُوٹ سیل لگی ہے۔''

''میں اُس سچ کی بات کر رہا ہوں جو سینکڑوں سال پہلے آسمان سے اترا تھا۔''

''کیا وہ سچ صدیوں بعد بھی سچ ہے، کیا اُس پر میری بیٹی کی طرح فریب کے لبادے نہیں اوڑھائے گئے؟

''ہاں۔ وہ سچ ہے اور رہے گا بھی۔ تمہاری بیٹی ہے اور رہے گی بھی۔ اور ایک دن تُم دیکھ بھی لو گے۔''

''تمہیں یقین ہے؟''

''ہاں۔ مجھے یقین ہے اور میں دوبارہ کہتا ہوں مجھے کامل یقین ہے۔ کبھی میں بے یقینی کا شکار تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب میں اسے جھوٹ ٹھیرا کر ایک غبی عالم سے مناظرے جیتنے کا شوقین تھا اور وہ ہار کر بھی نہیں تھکتا تھا۔ لیکن ایک دن اُس نے مجھے ایسی بات کہی کہ میرا

یقین کی بے یقینی پر بھروسا ٹوٹ گیا۔ اس کے صرف ایک جملے نے بساط الٹا دی۔۔۔ ’’تم سچ کو جانتے ہو۔ مانتے نہیں کیونکہ تم پورا سچ نہیں جانتے۔‘‘ اور جب میں نے اسے پورا جاننے کے لیے اچھی طرح پرکھا اور ٹٹولا بھی، تو مَیں مان گیا اور وہ جو مجھ سے ہر بار مناظرہ ہار جاتا تھا، ہمیشہ کے لیے جیت گیا۔‘‘

مَیں سر کھجاتے ہوئے حاضرین کی جانب نگاہ دوڑا رہا ہوں جو سوچ میں ڈوبے دکھائی دے رہے ہیں یا انتظار کر رہے ہیں کہ کب مجھ احمق، چھوٹے منہ سے بڑی باتیں اُگلنے والے، کے بودے بول ختم ہوں لیکن مجھے تو وہ نہیں روک سکا جو کبھی چاندی اور کبھی تانبے کے دھاگوں سے آنکھیں اور ہونٹ سیتا رہا ہے لیکن اب مَیں کیا کہوں کہ میری سمجھ دانی سے ایسی آوازیں آرہی ہیں جیسے دانے بھونے جا رہے ہیں اور یہ دانے بے حد قیمتی ہیں جو نگلنے مشکل ہیں اور اگر کسی کے حلق سے نیچے اتر گئے تو وہ ہزار بیماریوں سے نجات پائے گا۔ دماغ کی چولیں ہلانے والی بات یہ ہے کہ اِن میں سے کون سا دانہ اِس وقت چگنا موزوں ہے اور شاید یہ بات اُس دانا نے بھی محسوس کر لی ہے جبھی کہہ رہا ہے۔

’’تمہاری الجھن کی سلجھن مَیں اُس بات میں لپیٹ کر دیتا ہوں جو مَیں نے لوک کتھاؤں سے کشید کی تھی۔ تُم دھیان سے سنو، تُم سب دھیان سے سنو اور وہ یہ ہے کہ مچھلی ہمیشہ سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے۔‘‘

اس کے کشف سے مجھ پر منکشف ہوتا ہے جس میں مَیں دوسروں کو اعلانیہ شریک کرتا ہوں کہ ہمارا سر مسلسل سڑ رہا ہے اور اتنا سڑ چکا ہے کہ ہم اس کی سڑانڈ سے ناامید ہیں لیکن مجھے اُمید کی دودھیا روشنی نظر آتی ہے کہ ابھی ہمارے سر میں کئی خُلیے جان دار ہیں۔ اِنہیں توانا کریں تو اِن کی توانائی سے باقی حصے بھی بحال ہو جائیں گے اور ہمارے پیر تک ٹھیک ٹھیک کام کریں گے۔

اور جب میرا اعلان اختتام ہوا تو بجھا ہوا قمقمہ جل اُٹھا اور رکا ہوا پنکھا گھومنے لگا۔ لمبے بالوں والے شاعر، داڑھی منے شاعر اور داڑھی والے شاعر، ٹوپی پہنے کہانی کار اور نوحہ گرولی نے مجھے یوں دیکھا جیسے اندھیری راہ پر چلنے والا تھکا ہارا مسافر دُور سے آتی گاڑی کی روشن بتیاں دیکھتا ہے لیکن میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور مجھے آواز سنائی دیتی ہے۔

''او قید خانے کے رسیا! بتا تُو جو ہر دوسرے تیسرے دن یہاں آتا ہے اور میری لکھت مجھ سے سنتا ہے، تُو کبھی کچھ بولتا کیوں نہیں؟ میری باتیں تجھے سمجھ بھی آتی ہیں کہ نہیں؟''

اور وہ جس کا کھلے پنجرے میں دَم گھٹتا ہے، اُس کے ہونٹ وا ہوتے ہیں۔

''سمجھ تو نہیں آتیں۔ لیکن آپ، جو باتیں یہاں کرتے ہیں، اگر میرے قید خانے میں کریں تو تمام قیدی آپ کی خدمت کریں۔ آپ کو اچھے سے اچھا پھل، جو میسر ہو، پیش کریں۔ پسند کا کھانا سنتریوں کو کچھ دے دلا کر آپ کے لیے روز منگوائیں۔ جس نشے کی بھی طلب ہو، پورا کریں۔ آپ کی مٹھی چاپی کریں اور آپ کے حصے کی تمام مشقت اپنے ذمے لے لیں۔''

اُس کے خاموش ہوتے ہی چھوٹے سے کمرے میں بڑے بڑے سروں پر چھت آ گرتی ہے اور میں آنکھیں ملتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی دامن جھاڑتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے، تب میرے حلق سے چند الفاظ بہ مشکل نکلتے ہیں۔

کون کہتا ہے، حرف کی حرمت پامال ہو گئی؟

تیرہ جون دو ہزار سولہ عیسوی

شکم گزیدہ

ظفر دن بھر کا تھکا ہارا گھر آیا تو اماں نے کھانا دیتے وقت ایسی بات کی کہ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ ایک عرصہ تک یہ سننے کے لیے اس کے کان ترستے رہے تھے۔ اب خوشی سے ناچنے کے بجائے وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے چپ چاپ کھانا لیا اور اماں کو حیران چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

غریب کا بچہ جلد جوان ہو جاتا ہے اور بوڑھا بھی وقت سے پہلے ہوتا ہے۔ وہ بڈھا تو نہیں ہوا تھا لیکن چھوٹی عمر سے گھر کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے اندر سے تھک ضرور گیا تھا۔ اُسے عشق بھی جوان نہ رکھ سکا، شاید اِس لیے کہ ہر بار یکطرفہ تانا بُنتا تھا گو اُسے ہر شے سے عشق ہو جاتا تھا۔۔۔ خوب صورت اور بدصورت۔۔۔ جان دار اور بے جان۔۔۔ جو بھی قریب ہوتی۔ ظفر کو پہلے عشق کا گمان تب ہوا جب اُس کی عمر بارہ برس تھی اور وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

موسم گرما کی چھٹیوں میں نانی اماں کے گھر گیا تھا۔ ایک رات چھت پر سویا ہوا تھا۔ سورج کی جھلساتی کرنوں نے جب اُسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تو اُس نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پڑوس کی چھت پر اِک گوری چٹی، دبلی پتلی، محنت سے تراشے ہوئے بدن والی لڑکی ٹہل رہی تھی۔ سورج کی تمازت سے گلابی رُخساروں والی لڑکی عمر میں ظفر سے بڑی تھی لیکن عشق کی راہ میں عمر کبھی حائل نہیں ہوتی، کوئی اور ضرور ہوتا ہے۔

ظفر روز اجالا ہونے سے پہلے جاگ جاتا لیکن سورج سر پر آنے تک آنکھیں بند رکھتا۔ پھر مہ جبیں آجاتی، چھت کے ایک کونے سے دوسرے تک جاتی اور ظفر کی نگاہیں اس کے ساتھ حرکت کرتی رہتی تھیں۔ اُس کی ایک نظر سارا دن ظفر کو مخمور کیے رکھتی اور وہ شام کا انتظار کرتا کہ وہ چھت پر آئے گی اور ایک پُڑیا اور دے گی۔

ظفر کی اماں روز گھر واپسی کے لیے کہتی اور وہ کل کل کی رٹ لگاتا لیکن کب تک ٹال مٹول چلتی۔ وہ بس میں بیٹھا تو اس کے دل کی حالت ایسی تھی جیسے یتیم ہو گیا ہو۔ لاہور آ کر اُس کا دل سکول میں لگتا نہ گھر پر چین پڑتا۔ اگلے سال کی چھٹیوں تک وہ اُس کے حواس پر چھائی رہی۔

اب کی بار وہ نانی اماں کے گھر پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ بڑی مشکل سے رات کاٹی لیکن اِس دفعہ سورج کے ساتھ وہ مہ جبیں نہ آئی۔ شام ہونے کو آئی تو ظفر چھت کو لپکا اور ایک نظر کی آس میں ٹہلتا رہا لیکن وہ وہاں ہوتی تو پیاس بجھاتی، وہ تو کب کی پیا دیس سدھار چکی تھی۔ یوں ظفر کا پہلا خاموش عشق مکمل خاموشی سے ناکام ہو گیا۔

ظفر کی خوش قسمتی تھی کہ اِس معاشقے کا بخار چار ماہ میں اتر گیا اور بد قسمتی یہ تھی کہ نظریں اُستانی پر جا ٹکیں جس کا تھل تھل کرتا بدن اُس کے انگ انگ میں برقی رو دوڑا دیتا جسے وہ سمجھ نہ پاتا۔ اُستانی جی کے خط و خال اُس کے دماغ میں کئی نامکمل خاکے بناتے اور جب وہ مکمل کرنے کے قابل ہوا تو اُستاد کی جماعت میں پہنچ چکا تھا۔

اُستانی کا در چھوٹا تو وہ اِک راہ گیر کے دامن سے الجھ گیا۔ سکول کے راستے میں دونوں کی نظریں ملتیں تو ظفر کو وہی برقی رو دوڑتی محسوس ہوتی جسے سنبھالنا اُس کے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا لیکن کچھ ہو نہ سکا اور بات مسکرانے تک محدود رہی۔ وہ سونے سے پہلے اُستانی اور راہگیر محبوبہ کا تقابل کرتا اور اُسے اُستانی کے مخصوص اُبھار، جو راہگیر محبوبہ سے نمایاں تھے، نیند

میں بھی ستاتے رہتے لیکن وہ بیداری میں نئی محبوبہ پر فوکس کرتا اور کھلی آنکھوں سے سپنے دیکھتا۔ معلوم نہیں کہ کب تک رات دن کا پھیر جاری رہتا مگر ایک واقعہ نے سب تلپٹ کر دیا۔

ابھی ظفر نے دسویں کے امتحان دینے تھے۔ گھر میں واحد مرد ہونے کی وجہ سے ساری ذمہ داری اُس کے کندھوں پر آسمانی بجلی کی طرح آ گری اور وہ راستہ چھوٹ گیا جو سکول کو جاتا تھا۔ اُس نے دسویں کے امتحان دیے تو سہی لیکن ابا کی وفات کے ایک سال بعد۔۔۔

وہ سائیکل پر کاٹھ کباڑ اکٹھا کرنے لگا لیکن راہ گیر محبوبہ دل میں موجود تھی اور استانی کی جگہ سپنوں میں آنے لگی تھی۔ یہ سلسلہ کچھ ماہ جاری رہا اور ظفر نے کئی بار اُس سے بیاہ بھی رچایا البتہ بیداری کے ساتھ طلاق دینا پڑتی اور ایک دن پکی پکی نکال باہر کی کیونکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ کرنٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ اُس کے چھریرے بدن میں موجود کوئی شے لاوے کی طرح باہر نکلنا چاہتی تھی اور نکلتی بھی لیکن خواب میں۔۔۔ جبکہ وہ کسی کو نوچنا، پوجنا اور کسی میں سما کر بہہ جانا چاہتا تھا۔

ظفر نے سائیکل پر ٹین ڈبے اکٹھے کرنے کا کام بند کر کے ایک کارخانے میں مزدوری شروع کی تو اک اور صنم تراش لیا۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ اُس جٹی کے ساتھ گھومے پھرے لیکن خالی جیب ہمت چھین لیتی اور پہلے کی طرح صرف دیکھ کر گزارا کرتا رہا۔ وہ ایک گلی میں بنے کارخانے کے سامنے سے گزر رہی ہوتی تو دروازے میں کھڑے ظفر پر ایک نظر ضرور ڈالتی جس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلتے مگر آواز باہر نہ آتی اور آنکھوں سے دیے پیغام شاید ہوا میں موجود گرد لے اُڑتی۔ اُسے دیکھ دیکھ کر ظفر کے تن بدن میں برقی رو بلب جلائے بغیر لاحاصل دوڑتی رہی اور پھر۔۔۔ پھر وہ تھک گیا۔

وہ اِظہار چاہتا تھا اور کر نہیں پا رہا تھا تو یوں اُس کی سوچ کا دائرہ سمٹنے لگا اور کبھی کبھی ٹمکنا سا رہ جاتا جس سے ڈر کر وہ خود کا جائزہ لینے لگتا اور ایک دن اُسے معلوم ہوا کہ کوئی تکنیکی

خرابی نہیں، تھوڑا بے شرم ہونے کی ضرورت ہے اور مقدر بھی تھوڑے ڈھیلے ہیں جنہیں طنابیں ڈالنے کے لیے ظفر نے پڑھائی پر دھیان دینا شروع کر دیا۔ اِس دوران میں وہ برابر تانک جھانک کرتا رہا لیکن زیادہ زور پڑھنے پر رکھا اور ایک دن گریجوایٹ ہوگیا۔ تب اُس کے ماموں کے تعلقات کام آئے اور وہ ایک دفتر میں چھوٹا بابو بن گیا لیکن اکیلا کمانے والا اور چار جی کھانے والے تھے البتہ اُس کی منگنی ہوگئی۔

سدرہ خوب صورت تھی نہ بدصورت۔۔۔ پھر بھی برقی رو دوڑا دیتی لیکن ظفر ٹانکا لگا کر بلب جلانا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ کچھ کہنا اور سننا چاہتا تھا مگر سدرہ بی بی نے شادی سے پہلے میل جول بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور ظفر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس نے ساتھی کارکنوں پر نظر ڈالی لیکن بڑے بابو چھائے ہوئے تھے اور ایک دن وہ اُس بازار میں گیا۔۔۔ خوفزدہ۔۔۔ خدا سے یا خدائی سے۔۔۔ یہ اسے بھی معلوم نہ تھا۔ صدائیں آئیں، ''بابو! کچھ چاہیے؟ سستا بھی ہے۔'' وہ خاموشی سے گزر گیا اور ساز بنانے والوں کی دُکانیں دیکھ کر لوٹ آیا۔

ظفر وقت کے ساتھ کروٹیں بدل بدل کر راتیں گزارتا رہا۔ پہلے دوستوں کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا تھا۔ پھر باتوں میں بھی جی نہ لگتا لیکن وہ پڑھتا رہا اور تھوڑی ترقی کرتا رہا۔ اُس کے پاس اتنی ڈگریاں اور سٹرفکیٹ اکٹھے ہو چکے تھے کہ انھیں گول کر کے ڈنڈا بنا کر کسی کا بھی سر پھوڑا جا سکتا تھا۔ ایسے میں جی چاہتا کہ اب شادی ہو جائے اور بچے ہوں جن کے ساتھ وہ کھیلے۔۔۔ لڑکی ہو یا لڑکا۔۔۔ فرق نہیں پڑتا۔۔۔ لیکن وہ اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اُس پر مان کرنے والی دو چھوٹی بہنیں گھر بیٹھی تھیں۔ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہتا۔

''بچے کو ماں اور جوان کو باپ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔''

وہ دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے کسی کندھے کا متلاشی تھا۔ پتا نہیں کیوں اُسے اپنی ماں کا کندھا اس قابل نہ لگتا جس سے وہ صرف کام کی بات کرتا تھا۔ ہر ماہ تنخواہ لا کر اس

کے ہاتھ پر رکھ دیتا اور بس۔۔۔ وہ گھر کا ہر ضروری کام ایسے ہی بڑی ذمہ داری سے کرتا جیسے دفتر میں حاضری لگاتا تھا لیکن گھر میں سب سے الگ تھلگ اپنے کمرے میں پڑا رہتا جو اُسی کی طرح تھا جس میں غبار تھا اور خلا بھی جسے پُر کرنے کے لیے وہ سہارے ڈھونڈتا لیکن جس طرف ہاتھ بڑھاتا، خالی لوٹ آتا۔ ظفر سمجھتا کہ وہ امیر نہیں، اس لیے کوئی ساتھ دینے کو تیار نہیں، اوپر سے شکل بھی خاص نہیں تھی۔ جب کوئی نہ ملا تو وہ چڑ چڑا ہو گیا اور تنہائی پسند تو وہ پہلے ہی تھا۔ اس کی نا سمجھ ماں سب سمجھتی تھی لیکن دو بیٹیاں بھی جوان ہو رہی تھیں۔

جب اُسے سب دروازے بند نظر آئے تو اُس نے اپنے آپ میں راستہ تلاش لیا لیکن روح بھی کچھ تقاضا کرتی تھی اور اسے لگتا کہ وہ کچھ بُرا کر رہا ہے۔ وہ خود کو ناشکرا سمجھتا اور کبھی کبھار اُسے محسوس ہوتا کہ وہ ٹھیک کر رہا ہے۔ اکثر خود کلامی کرتا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ بیشتر کہتا کہ زیادہ انتظار سے پھل گل سڑ جاتا ہے یا پلپلا ہو جاتا ہے۔ اُس کی سوچ کا دھارا کبھی ایک سمت میں نہ بہتا اور خیالات گڈ مڈ ہوتے رہتے جس سے کھوپڑی چٹخنے لگتی اور وہ ہر اس چیز سے چڑ جاتا جو اس کے پاس نہیں تھی۔

بعض اوقات چڑ چڑا پن اُس قدر بڑھ جاتا کہ وہ گھر میں بھی گالیاں بکنے لگتا تھا۔ اسے شبہ ہوتا کہ وہ ماں سے۔۔۔ بہنوں سے۔۔۔ سدرہ سے۔۔۔ اور اُس سے بھی ناراض ہے جسے ہر بُرے وقت میں مدد کے لیے پکارتا ہے۔ وہ اُس کے در پر نہیں جاتا تھا لیکن جب کوئی انجانا خوف ستاتا تو وہی یاد آتا تھا۔ جب وہ خود پر مان کرتا تو اُس کا مشکور بھی ہوتا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہتی۔ وہ نالائق لوگوں کو اچھی چیزوں کے ساتھ دیکھ کر اُبلنے لگتا اور سوچتا کہ اُسے زیادہ محنت کے باوجود کم ملا۔۔۔ اور نفرت کی آگ میں جلتا رہتا لیکن زیادہ متنفر وہ خود سے تھا مگر کوئی انسان جیتے جی کب تک نفرت کر سکتا ہے؟ آخر طغیانی پر سکوت فتح یاب ہوا جو، پتا نہیں، کتابی کیڑا بن کر بُنی دنیا کی دین تھا یا عمر بڑھنے کے ساتھ خون کی رفتار گھٹنے لگی

تھی یا شاید وہ تھک گیا تھا۔

چوتھی دہائی پوری ہونے کو تھی اور سدرہ کا خیال گول گیند جیسی زمین سے سمٹ کر ایک چھوٹا سا نقطہ بن گیا تھا۔کمائی بڑھ چکی تھی جس سے بہنوں کو جہیز کے ساتھ رخصت کر کے وہ مطمئن ہو گیا تھا۔اب گھر میں وہ تھا یا اماں تھیں جنہوں نے شادی کے لیے دن طے کرنے کی خبر سنا کر اُس کی ایک کمرے میں ٹی وی اور کتابوں کے ساتھ بسی جامد دنیا میں ہلچل مچادی تھی اور وہ کھانا کھاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔''اب کیا ضرورت ہے؟''

نو فروری دو ہزار دس عیسوی

بھکاری

وہ بھکاری نہیں تھا، کم از کم مجھے تو نہیں لگتا تھا۔ اُس کی میلی چادر میں کئی راہ گیر بھیک ڈال دیتے لیکن وہ بھکاری نہیں تھا۔ میں روز اُسے ایک موڑ پر جھولی پھیلائے بیٹھا دیکھتا۔ وہ کوئی صدا نہیں لگاتا تھا۔ اِسی جگہ کئی بھکاری اِشارے پر رُکنے والی گاڑیوں کے گرد منڈلاتے تو اُن کی الگ الگ صدائیں ہر کسی کو متوجہ کرتیں لیکن وہ خاموشی کے ساتھ آسمان تکتا رہتا۔ مَیں نے اُسے ہمیشہ دن کے وقت دیکھا تھا، اس لیے وہ تارے تو نہیں گنتا تھا، پھر پتا نہیں کیا ڈھونڈتا تھا۔ اِس چوک میں کافی رش ہوتا ہے اور شور بھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ گاڑیوں کی پاں، پاں، ٹی، ٹی۔۔۔ رکشہ والوں کی آوازیں۔۔۔ اِدھر آؤ جی، کدھر جانا ہے؟ وہ سب چیزوں سے بے پرواہ دِکھائی دیتا تھا خالی نظروں سے اوپر دیکھتا ہوا۔۔۔ اور لوگ اُس کی جھولی میں خیرات پھینکتے جاتے تھے۔ مَیں دفتر جاتے ہوئے جب اِس اشارے پر دومنٹ کے لیے رکتا تو کار میں بیٹھا اُسے دیکھتا رہتا اور کبھی اُس کی نظر بھی پڑ جاتی تھی۔

وُہ شاید نہاتا نہیں تھا۔ بال آپس میں یوں چپکے ہوئے تھے جیسے رسی بنانا چاہ رہے ہوں۔ ماتھا کشادہ تھا جس پر وقت نے تین چار سلوٹیں ڈال دی تھیں۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن میں اِکادُکا سرخ لکیریں بھی تھیں جو محنت کشوں کی خاص نشانی ہوتی ہیں۔ اُس کی آنکھیں دیکھ کر ہی پتا چلتا تھا کہ وہ بھکاری نہیں۔ اُس کی آنکھوں میں شرمندگی کی لہریں بھی تھیں، خبر نہیں کس بات کی، بھکاری پن کی یا کسی اور بات کی۔۔۔ ناک کے ساتھ دائیں

گال پر ایک نشان تھا جو کسی پُرانے زخم کی یادگار لگتا تھا۔نشان بظاہر چھوٹا تھا کہ اِس کا بڑا حصہ داڑھی نے چھپا رکھا تھا جو اُس کے لباس کی طرح بے ترتیب اور میل سے اَٹی ہوئی تھی اور معلوم دیتا کہ کبھی اُسترے کی زد میں نہیں آئی تھی۔موچھیں تو ایسی تھیں جیسے حجام کی دکان سے کٹے بال پکڑ کر کسی نے گوند سے آڑے ترچھے چپکا دیے ہوں۔گردن پر ایک اور نشان تھا جو گال والے نشان سے زیادہ بڑا تھا۔پٹھانوں کے رنگ گورے ہوتے ہیں سو اُس کا بھی تھا لیکن میل کی تہہ در تہہ چادر نے مری چھپکلی سا کر دیا تھا۔

نہیں جانتا کہ اُس کی عمر کتنی تھی لیکن بڑھاپے میں داخل ہوئے کافی سمے بیت چکا تھا۔معلوم پڑتا کہ کبھی بڑا گھبرو تھا، جس گلی سے گزرتا ہوگا اِس میں کئی کھڑکیاں اُس کے لیے ضرور کھلتی ہوں گی۔اُس کے ہاتھوں کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور نشہ کرنے والوں کی بھی ایسی ہی ہوتی ہیں مگر وہ نشئی تھا نہ دمے کا مریض تھا۔اُس کی رگیں تو ہل کھینچنے والے کسانوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔اُس کے ہاتھ دیکھ کر لگتا تھا کہ اِنھوں نے کبھی لاتعداد پتھر پاش پاش کیے ہوں گے۔اب تو وہ بھکاری لگتا تھا گو بھکاری نہیں تھا۔وہ بس بیٹھا رہتا اور لوگ اُس کے پاس فالتو پیسے پھینک کر آگے بڑھ جاتے۔

اُسے ہر بار دیکھ کر یہی محسوس ہوتا کہ ایک زبردست فیچر مل سکتا ہے۔اُس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر روز یہی سوچ کر گزر جاتا کہ کل بات کروں گا اور وُہ کل بھی ایک دن آ ہی گئی۔اُس روز سحری سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔دفتر جانا نہیں چاہتا تھا مگر میکانکی انداز میں جا رہا تھا۔اِشارے پر کار رکی تو وہ حسبِ معمول آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا جس میں اَن گنت سوراخ ہو گئے تھے، آنسوؤں جیسا نمکین پانی قطرہ قطرہ گر رہا تھا اور وُہ بھیگ رہا تھا۔لوگ سروں پر چھاتے تانے آ جا رہے تھے۔جو چھتری نہیں خرید سکتے تھے وہ خود کو کوستے جا رہے تھے۔چند راہ گیر دُکانوں اور کچھ عمارتوں کے سایوں میں کھڑے بارش کے رُکنے کا انتظار کر رہے تھے۔سائیکل اور موٹر سائیکل پر آنے جانے والوں کی شامت آئی ہوئی تھی۔

مجھ ایسے گاڑیوں میں بیٹھے اُن پر چھینٹے اڑاتے ہوئے گنگناتے جا رہے تھے لیکن وہ بھیگ رہا تھا اور تھوڑا تھوڑا کانپ بھی رہا تھا۔ وہیں پاس ہی، کئی بھکاری بلند و بالا عمارت کے بڑھے ہوئے چھجے کے نیچے کھڑے تھے لیکن وہ سارے ماحول سے لاتعلق اپنی جگہ پر بیٹھا بھیگ رہا تھا۔

اُس دن رِم جھم پڑتی پھوار سارا دن نہ رُکی۔ ایسی جھڑی لگی کہ کئی فصلیں ہری ہوئیں اور کئی ایک بہہ گئیں۔ دفتر سے واپسی پر مَیں اُسی اشارے پر رکا تو اُسے کچے مکان کی چھت کی طرح زمین پر گرا دیکھا، نجانے کب سے بے سُدھ پڑا تھا اور لوگ آ جا رہے تھے۔ مَیں نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی۔ اُسے بڑی مشکل سے دو راہگیروں کی مدد لے کر گاڑی میں لٹایا اور نزدیکی سرکاری ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے اُسے ایسے ہی دیکھا جیسے ایسوں کو دیکھا جاتا ہے۔ پھر وہ زیرِ تربیت خاتون سے محوِ گفتگو ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے یاد دلایا کہ بھائی میاں ابھی کسی کو تیری ضرورت ہے۔

''آپ اُس کے لیے اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ مجھے تو وہ بھکاری لگتا ہے۔ دوائیاں لکھ دی ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر نے بیزاری سے کہا جس پر میں یہی کہہ سکا۔

''وہ بھکاری نہیں۔''

اور دو تین بڑوں سے رابطے کیے اور لاغر بوڑھے کو مسیحائی مل گئی۔ بیوی جھگڑ کر میکے گئی ہوئی تھی لہٰذا میں آزاد تھا تو اُسے گھر لے آیا کہ ایک زبردست فیچر مل جائے گا۔ دفتر سے چھٹیاں لیں، چار پانچ فلم خریدے، خشک میوہ جات لایا اور اسے کھلایا، پلایا۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ مجھے فرشتہ سمجھنے لگا۔ مَیں نے اُس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ پھر میں نے ذرا اور واضح انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ پھر بھی نہ مانا جس پر میں نے انتہائی سرد مہری سے کہا۔ ''مجھے صرف آپ کی کہانی سے دلچسپی ہے۔''

اُس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور تھوڑی سی ٹال مٹول کے بعد میرے اصرار پر بولا۔ ''مَیں اُس علاقے میں پیدا ہوا جہاں سے بری خبریں آج کل بہت آتی ہیں۔ تھوڑی

بہت تعلیم بھی حاصل کی۔ چھوٹی موٹی نوکری بھی کرتا رہا۔ اپنے قبیلے کی خوبرو لڑکی سے شادی ہوئی اور دو بچے ہوئے۔ مَیں اس علاقے میں پیدا ہوا جہاں بچے دوا چھے نہیں ہوتے۔'' اُس نے سانس درست کیا اور پھر بولا۔ ''میری زندگی بری نہیں گزر رہی تھی۔ حالانکہ میرے کئی جاننے والے کہتے کہ مجھے دارالحکومت جا کر کوئی کام کرنا چاہئے۔ وہ مجھے بابو کہتے تھے۔ مگر میں وہیں رہا جہاں میں پیدا ہوا تھا، جہاں میرے بچے تھے اور میری بیوی تھی۔''

مَیں نے ٹی وی کی آواز کم کی اور کہا کہ بولتے جائیں، رک کیوں گئے مگر وہ تھوڑی دیر خاموش رہا، چھت کے پار دیکھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ تو جانتے ہیں کہ ساری دنیا میں ہر وقت کہیں نہ کہیں جنگ ہو رہی ہوتی ہے۔ میرے بچے پیدا ہوئے تھے تو پڑوس میں برفانی علاقوں سے آئی سپاہ کے خلاف لڑا جا رہا تھا، ڈالر آ رہے تھے، آدمی جا رہے تھے، واپس نہیں آ رہے تھے، میں کہیں نہیں گیا، بیوی بچوں کے پاس رہا۔ جب میرے بچے جوان ہوئے تو پڑوس پر ایک اور ملک کی سپاہ حملہ آور ہو چکی تھیں۔ کوئی اس لڑائی کو میرے دین کے خلاف کہتا، کوئی اسے وسائل پر قبضے کی سازش کہتا، کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ کہتا، ہر کوئی کچھ نہ کچھ رہتا اور مجھے سمجھ نہ آتی کہ سچ کیا ہے!''

میں نے ایک سرد آہ بھری اور کہا کہ آج کے دور میں جہاں معلومات کا سیلاب آ گیا ہے وہاں غلط معلومات کا طوفان بھی اٹھایا گیا ہے اور سچ ان سب کے نیچے دب گیا۔ مَیں سارا دن سچ جھوٹ کی تلاش میں رہتا ہوں اور مجھے بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ میں ایک عرصے سے اُس علاقے میں جا کر لوگوں کی زندگی دیکھنا چاہتا ہوں، معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں، مگر ڈرتا ہوں اور اپنے بیوی بچوں کے پاس رہتا ہوں، بالکل آپ کی طرح، خیر آپ کہیے۔

''میں کیا کہوں؟ مجھے کچھ پتا نہیں، مجھے اتنا پتا ہے کہ ایک سانڈ کھلا گھوم رہا ہے اور روندتا جا رہا ہے، مجھے نہیں پتا کہ وہ کیوں روند رہا ہے لیکن یہ مجھے پتا ہے کہ اُس نے جو بستیاں، جو قبیلے روندے، وہ میرے لوگوں کے تھے۔ انگلیوں پر گن لیں، سارے ملک وہی

ہیں، کہیں وہ بھائی کو بھائی سے لڑا رہا ہے، کہیں وہ ایک دشمن کھڑا کر کے ڈرا رہا ہے اور پیسہ کما رہا ہے مگر مصیبت یہ ہوئی کہ وہ سانڈ پڑوسی ملکوں سے ہوتا ہوا، ہمارے گھر پہنچ گیا اور لوگ مرنے لگے۔ کوئی مرنے والوں کو شہید کہتا، کوئی جہنمی، کوئی مارنے کو مجاہد کہتا، کوئی باڑے کا ٹٹو، مجھے نہیں پتا کہ کون کیا ہے، مجھے یہ پتا ہے کہ میرے لوگ مر رہے تھے، میرے لوگ مر رہے ہیں، مارنے والے بھی اپنے، مرنے والے بھی اپنے۔''

مجھے عبید اللہ علیم کا مصرع یاد آ گیا۔۔۔ میرے شہر جل رہے ہیں، میرے لوگ مر رہے ہیں

''بالکل یہی بات ہے۔'' اس نے تصدیق کی مہر ثبت کی۔

''تو آپ کی یہ حالت کیسے ہو گئی؟''

''حالت؟ تمہارا گھر اجڑ جائے تو تمہاری بھی یہی حالت ہو گی سر!''

اُس کے لہجے کی تلخی نے سرسراہٹ سی دوڑا دی مگر میں خاموش رہا تو وہ چند ساعتیں ہاتھ ملنے کے بعد بولا۔ ''ایک دن میں گھر واپس گیا تو میرا گھر، گھر نہیں رہا تھا، ملبہ تھا اور اس ملبے کے نیچے میری بیوی اور بچی کی لاشیں۔۔۔''

''اوہ۔ آئی ایم سوری۔۔۔''

کمرے میں خاموشی نے جگہ بنا لی اور جب آنکھوں کے راستے درد تھوڑا بہہ گیا تو وہ اعصاب مجتمع کر کے قدرے اونچی آواز میں بولا۔ ''میں اپنے بیٹے کو لے کر صوبائی دارالحکومت چلا گیا، جسے بابو کہتے تھے، وہ مزدور بن گیا، میرا بیٹا بھی مزدور بن گیا، زندگی گزرنے لگی، میں اسے انتقام کا ایندھن بننے سے بچائے رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے زندگی کی راہ دکھانے لگا مگر ایک روز وہ ایسا گیا کہ کبھی واپس نہیں آیا۔ میں نے شہر شہر اسے ڈھونڈا اور ڈھونڈتا ڈھونڈتا یہاں آ گیا۔ کبھی مجھے کوئی بتاتا کہ وہ مر گیا، کبھی مجھے کوئی کہتا کہ وہ زندہ ہے، کبھی مجھے کوئی بتاتا کہ وہ برے لوگوں میں شامل ہو گیا، کبھی مجھے کوئی سمجھاتا کہ وہ

اچھے لوگوں کے ساتھ ہے۔ پتا نہیں کیا برا ہے، کیا اچھا ہے، جس کو جس سے فائدہ ملتا ہے، اسے اچھا کہہ دیتا ہے۔ مگر میرے لیے تو وہ اچھا ہے، وہ میرا بیٹا ہے، اور مجھے معلوم نہیں کہاں ہے! زندہ ہے یا مر گیا اور مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں زندہ ہوں یا مردہ!''

مجھے وہ اس وقت مرا ہوا معلوم دیا مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، مجھے خیال آیا کہ یہ آنکھیں اس وقت بند ہو جائیں گی جب وہ دیکھ لیں گی جو دیکھنا چاہتی ہیں۔

''آپ کا بیٹا دہشت گردوں کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو؟''

''کون دہشت گرد؟''

''وہی جو جگہ جگہ دھماکے کر رہے ہیں، اپنوں کو مار رہے ہیں، غیروں کو خوش کر رہے ہیں، جنھوں نے آپ کی بیوی اور بچی بھی۔۔۔''

''میرے گھر پر میزائل گرا تھا۔۔۔''

اس بار خاموشی بہت طویل ہو گئی اور جب مجھے چبھنے لگی تو میں چپ نہ رہ سکا اور ایک جھجھک لیے پوچھا۔ ''اس سب کے باوجود آپ بھی۔۔۔ کاری۔۔۔ کیوں بن گئے؟'' اُس نے زہر خند مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور قدرے توقف سے گویا ہوا۔

''یہاں لوگ حق دار کو حق تو دور واجب مزدوری تک نہیں دیتے، بھیک دے دیتے ہیں۔''

''ہاں، مگر پٹھان تو ایسے نہیں ۔۔۔''

اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''پوری پوری نسل برباد کر دی جائے تو۔۔۔؟''

میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا اگرچہ طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ یوں بھی کہانی سنتے سنتے رات گزر چکی تھی۔ سویرا ہونے کو تھا۔ چڑیاں گھونسلوں سے نکل کر چہچہا رہی تھیں۔ دور کہیں موذن بھی اذان دے رہا تھا۔ اس سے پہلے پہرے دار کی سیٹی بھی سنائی دی تھی لیکن کمرے میں سناٹا تھا۔

چار فروری دو ہزار دس عیسوی

صحرا اور ڈوبتا چاند

انسان کا معدہ بڑی بری بلا ہے۔ یہی وہ بلا ہے جو دس سال کے شمس کو کھا گئی۔ وہ میرے ساتھ اِس بلا سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا اور اُس کا دوست حسن بھی ہمراہ تھا جس کا کوئی مائی باپ نہ تھا۔ وہ شمس سے دس مہینے بڑا تھا اور مَیں دونوں سے سات آٹھ سال پہلے دنیا میں آیا تھا۔ مَیں نے شمس کے لیے فرار کا منصوبہ بنایا تھا جس میں حسن بھی شامل ہو گیا۔ وہ ڈیڑھ دن سے بھوکا تھا اور سمجھا ہم جہنم سے نکل کر جنت کی طرف جا رہے ہیں۔ جب اُس کے پاؤں میں چلتے چلتے چھالے پڑ گئے تو اُسے پتا چلا کہ یہ راہ نہیں آسان لیکن اب لوٹ بھی نہیں سکتا تھا۔

جب سورج آگ برساتا تو ریت کے ذرے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے اور حسن کے پاؤں میں پڑے چھالے یہ چمکتے موتی برداشت نہ کر پاتے اور وہ بار بار بیٹھ جاتا، پاؤں ہاتھ میں پکڑ پکڑ کر دیکھتا اور میں بے بسی سے آسمان تکتا کہ ابھی تو اُسے لمبا راستہ طے کرنا تھا۔

جمعہ گوٹھ سے چلے ہمیں تین دن ہونے کو تھے اور شمس کو مرے ابھی دو دن ہوئے تھے۔ شمس دیکھنے میں سوکھا سڑا لگتا تھا مگر تھا بہت سخت جان، وہ شرارتیں بھی بڑی کرتا تھا لیکن بھوک نے اُسے اسی طرح کھا لیا، جیسے گندے پانی نے جمعہ گوٹھ کے کئی لوگ نگل لیے تھے۔

پیٹ بھی عجیب ہے۔ بھرا ہو تو نقصان، خالی ہو تو اور بھی نقصان۔ کچھ الٹا سیدھا کھا لو تو ہیضہ ہو جاتا ہے۔ کچھ نہ کھاؤ تو انتڑیاں خشک ہو کر آپس میں اٹکل پچو شروع کر دیتی ہیں اور

انسان دوہرا ہو جاتا ہے۔ شمس بھی کئی بار دوہرا ہوا۔ وہ جب بھی دوہرا ہوتا، مجھے تہرا چوہرا لگتا۔ وہ کمر کے بل لیٹتا، ٹانگیں پیٹ سے جوڑنے کی کوشش کرتا کہ پیٹ کے اندر نہیں تو چلو باہر ہی ماس لگ جائے۔ اُس کی انتڑیاں اٹکل پچو سے تھک کر نچڑنا شروع ہوگئی تھیں۔ ہم اسی سے بچنے کے لیے بھاگے تھے مگر شمس زیادہ دور تک نہ بھاگ سکا۔

اُس کے پیٹ میں جب عجیب وغریب چیزیں اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ جاتیں تو وہ مسکراہٹ کا منہ چڑاتے ہوئے کبھی کسی جھاڑی اور کبھی کسی کی راکھ ہتھیلی پر رکھ کر پوچھتا۔ ''یہ کھانے سے کچھ ہوتا تو نہیں۔'' حسن اُس کی بات سن کر ہنس پڑتا اور میں نہ رونے کی کوشش کرتا۔ میں تین افراد پر مشتمل اس مہاجر قافلے کا سربراہ جو ٹھیرا تھا سو میں رو نہیں سکتا تھا۔ یوں بھی حالات ہم پر رو رہے تھے تو ہمیں رونے کی کیا ضرورت تھی۔ جب میں اور حسن شہر پہنچے تھے تو وہاں ٹی وی پر کئی لوگ ہمارے لیے رو رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شمس خالی پیٹ روتا تھا اور ٹی وی پر رونے والوں کی جیبیں بھی بھری ہوئی تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی رونا نہیں آیا تھا۔

جمعہ گوٹھ میں مرد روتے نہیں تھے۔ یہ مردانگی کا سوال تھا اور یہاں ایک مردانگی ہی بچی تھی ورنہ آسمان روٹھ جاتا تو پینے کو پانی ہوتا نہ کھانے کو روٹی بچتی۔ جانوروں کے لیے چارہ تک نہ رہتا۔ کتے بلیوں کا پتا نہیں، اگر گائے بھی گوشت خور جانور ہوتی تو وہ ایک دوسرے کو کھا کھا کر گزارہ کر لیتیں۔ بھیڑیں ایک دوسرے کو رانیں دردِ دل کے واسطے ضرور پیش کرتیں، لیکن وہ گوشت خور نہیں تھیں۔ ہم گوشت خور تھے۔ عید کے عید گوشت کھاتے تھے ، جب شہر سے لوگ خیرات کرنے آتے تھے۔

میں ریت پر رنگ برنگی موٹی دری بچھائے، آسماں پر تاروں کا تعاقب کرتے، اکثر خود سے ایک سوال کرتا تھا۔ ''یہ شہر کے لوگ گرمیوں میں خیرات کرنے کیوں نہیں آتے؟'' میرے پاس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ خود ہی سوچ لیتا کہ گرمیوں میں شہر

کے لوگ بھی بھوک پیاس سے بیمار پڑ جاتے ہوں گے یا پھر اُنھیں کوئی اور پریشانی ہوتی ہوگی ورنہ ہماری خبریں اُن تک پہنچتی تو ضرور ہوں گی۔ پچھلے سال گرمیوں میں مَیں شہر والوں کی راہ تکتے تکتے تھک گیا تو خود شہر جانے کا سوچا۔ یہی صحیح وقت تھا۔ جمعہ گوٹھ سے کئی لوگ جا رہے تھے تو مجھے بھی جانا ہی چاہئے تھا۔

ہم اس دھرتی کے لال ہیں جس کی مٹی سنہری ہے اور جس کے ٹیلے سبز ہیں، ٹیلے ہرے ہوں تو ہمارے جانور زندہ ہوتے ہیں اور جانور زندہ ہوں تو ہم زندہ رہتے ہیں لیکن اب ہمارے ٹیلے ہرے نہیں رہے، سنہرے ہو چکے ہیں اور ہمارے جانور بھی نہیں رہے، ہڈیاں رہ گئی ہیں۔

ہم اسی دھرتی کے لال ہیں جو پانی کے عظیم دیوتا کی گزرگاہ بھی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بیدار رہتا ہے لیکن مجھے خوابیدہ ہی نظر آتا ہے۔ مجھے یہی دکھائی دیتا ہے کہ وہ کبھی ایک آنکھ کھول کر اردگرد دیکھتا ہے اور کبھی دونوں آنکھیں کھول لیتا ہے۔ کبھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہے لیکن یہ ہم پر کرم کی نظر کرتا ہے نہ کوئی اِسے ہم تک لانے کی کوشش کرتا ہے اور ریت کے نیچے، کوئلے کے نیچے پانی کو بھی اوپر لانے کی، پینے لائق بنانے کی کسی کو توفیق نہیں ہوتی۔

میرے دادا کہتے تھے کہ اگلے وقتوں میں یہاں سے بہت دُور ایک بہادر ساری رات پانی کے دیوتا سے لڑتا رہا۔ دیوتا نے اُسے کئی بار چاروں شانے چت کیا لیکن وہ پھر کھڑا ہو جاتا۔ دیوتا اُسے دور دور پھینکتا مگر وہ پھر جا چمٹتا۔ شب بھر بدمست سانڈ کی طرح ٹکراتا رہا۔ ٹکراتے ٹکراتے رات گزرنے والی تھی۔ پھر کیا ہوا کہ سورج کی پہلی کرن کے رات کی سیاہی کا سینہ چیر کر اُس تک پہنچنے سے پہلے اور زندگی کی بازی ہارنے سے کچھ لمحے قبل اُس نے دیوتا کا دل جیت لیا۔ اب تو مشینیں ہیں بڑی بڑی، کوئی ان مشینوں کو ہی دیوتا سے لڑا دے جیسے دور دیس سے آئے شکاریوں کے لیے بھڑایا گیا تھا اور صحرا میں نخلستان بنایا گیا تھا۔

ہم صحرا کے بچے ہیں جو پانی کے لیے جھولیاں پھیلائے رکھتے ہیں۔ آسمان کی طرف

دیکھتے رہتے ہیں، لیکن آسمان چند برس سے ہماری طرف نہیں دیکھ رہا۔ جب آسمان ہی نہیں دیکھ رہا تو کوئی اور کیا دیکھے گا، لیکن میں نے دیکھا۔ میں نے شمس کو مرتے ہوئے دیکھا، اور بھی کئی لوگوں کو دیکھا لیکن شمس کو مرتے ہوئے دیکھنا کچھ عجیب تھا۔

شمس جب مر رہا تھا، اس کے گلے کے قریب ایک ہڈی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا یہ ہڈی عورتوں کی نظر آئے تو حسن کی نشانی ہوتی ہے۔ جمعہ گوٹھ اور آس پاس کے کئی گوٹھوں میں یہ حسن بکھرا پڑا تھا۔ یوں کہنا چاہئے کہ حسن بکھر بکھر رہا تھا، جیسے شمس بکھر گیا۔ بچھڑ گیا تھا۔ پہلے وہ مائی سکینہ سے جدا ہوا تھا جس سے سائیں ذوالفقار یعنی میرا باپ کئی سال پہلے بچھڑ چکا تھا۔ مائی سکینہ کی ہڈی بھی نظر آتی تھی۔ اُس کے بازوؤں میں پڑی چوڑیاں چوڑی ہوگئی تھیں۔ چٹی چوڑیوں کے نیچے سے بھی ہڈی نظر آتی تھی۔ جب وہ مری تھی تو اُس کے چہرے پر وہ ہڈیاں نظر آرہی تھیں، جن کے اوپر ماس ہو تو ننھے منے گڑھے پڑتے ہیں۔

مائی سکینہ کے پاس ایک ریڈیو تھا جو سائیں ذوالفقار شہر سے لایا تھا۔ وہ ایک بار شہر گیا تھا، دوبارہ جانا چاہتا تھا لیکن کبھی جا نہیں سکا تھا۔ پچھلے سال گرمیوں میں، جن دنوں آسمان ناراض تھا، مائی سکینہ کے ریڈیو پر ایک خبر چلی تھی کہ ہمارے آقا گندم کی بوریاں، صاف پانی کی بڑی بڑی بوتلیں اور دوائیاں صحرا کے بچوں کے لیے بھیج رہے ہیں۔ مائی سکینہ بڑی خوش ہوئی تھی۔ سب خوش ہوئے تھے لیکن مائی سکینہ مر گئی۔ میری ماں مر گئی۔

مائی کے بعد مجھے اور شمس کو کچھ دن آس پاس سے کھانے کو ملتا رہا۔ وہ بھلے لوگ اپنے حصے میں سے کچھ نہ کچھ دے دیتے۔ گندم کی بوریوں کی خبر بھی دیتے جو بس اب پہنچنے ہی والی تھیں۔ سنا تھا پلاسٹک کے بڑے تھیلوں میں گوشت بھی آرہا ہے۔ اُن دنوں میں کھلے آسمان تلے تاروں کا تعاقب زیادہ کرنے لگا تھا۔ تارے موٹی موٹی بوٹیوں کی طرح نظر آتے، جب دور چلے جاتے تو روٹی کا روپ دھار لیتے۔ چاند کبھی روٹی کے سخت کناروں کی طرح نظر آتا

اور کبھی آدھی روٹی لگتا۔ یہ کافی دن پہلے پوری روٹی کی طرح تھا۔ لیکن ایسا وقت آ پہنچا کہ پوری روٹی آتی نہ آدھی ملتی۔

کب تک تاروں کے پیچھے بھاگا جا سکتا ہے۔ ایک دن ہر کوئی تھک جاتا ہے۔ میں بھی تھک گیا۔ شمس کو ساتھ لیا۔ ہر وہ شے جو قیمتی لگی، تھیلے میں ڈال کر ساتھ لے لی۔ میں تھیلا کندھے پر ڈالے شمس اور حسن کے درمیان امام کی طرح چلتا رہا۔ تین گوٹھوں میں ٹھیرنے کے بعد ہمارے پاس تھیلا رہا تھا نہ شمس۔ میں اور حسن پھر بھی چلتے رہے۔ راتوں کو تارے شمس کی طرح میرا منہ چڑاتے۔ دن کو اگنی دیو آنکھیں دِکھاتا۔ ہم ٹیڑھا منہ اور سرخ آنکھیں دیکھ دیکھ کر چوتھے گوٹھ پہنچے۔ یہاں لمبی ڈاڑھیوں والے کچھ لوگ روٹیاں دے رہے تھے۔ وہ پانی بھی دیتے۔ اُن کے پاس گوشت تھا جو تھوڑا تھوڑا سب کو ملتا۔ ہمیں بھی ملا۔ حسن اتنا کچھ دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ اُس نے معدے میں زیادہ ٹھونس لیا اور بیمار پڑ گیا۔ داڑھی والے لوگوں کے پاس دوائیاں بھی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

''کیا تمھیں ہمارے آقا نے بھیجا ہے؟'' بڑھاپے کو گلے لگانے والے ایک شخص نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ میں حیران ہو گیا کہ یہ بوڑھا ہو گیا ہے اور اِسے ہمارے آقا کا نہیں پتا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ وہی۔۔۔ جس نے ہمارے لیے گندم کی ڈھیروں بوریاں، پانی کی بڑی بڑی بوتلیں، گوشت کے تھیلے اور دوائیاں بھیجی ہیں۔ اب حیران ہونے کی باری اُس کی تھی مگر میں نے اُسے زیادہ دیر حیران نہیں رہنے دیا اور پوچھا۔

''تم لوگ جمعہ گوٹھ کب جاؤ گے؟''

وہ بکھری بکھری داڑھی والا بوڑھا تھوڑا پریشان ہو گیا اور پھر ایسے بولا جیسے شرمندہ ہو۔

''ہمارے پاس سامان تھوڑا ہے۔ جمعہ گوٹھ بہت دور ہے۔ دوبارہ سامان اکٹھا کر کے وہاں جائیں گے۔'' مجھے تھوڑا غصہ آیا کہ تب تک تو ہمارے آقا کی گندم بھی پہنچ جائے گی۔ یہ بات میں نے اس سے نہیں کہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کب واپس شہر جائیں گے۔ وہ

جلد واپس جانے والے تھے۔ میں نے منت کی کہ مجھے اور حسن کو بھی ساتھ لے جائیں۔ اُنھوں نے انکار کر دیا لیکن میں نے پیچھا نہیں چھوڑا جس پر اُنھوں نے ہمیں کچھ روپے دے دیے اور ایک پتا بتا دیا۔

ہمارے لیے داڑھی والوں کا دیا سامان اور روپے چاند سے زیادہ چمک دار تھے، جن سے ہم کچھ دن بعد ایک شہر پہنچ گئے۔ یہاں ہم داڑھی والوں کے پاس رہتے ہیں۔ میں ٹال ٹپال کرتا ہوں۔ حسن قرآن پڑھتا ہے۔ رہنے کے لیے جگہ ہے۔ کھانے کو ملتا ہے اور پانی بھی صاف ہوتا ہے۔ قریب ہی ایک دکان پر ٹی وی ہے جس پر ہمارا آقا نظر آتا ہے جو کہتا ہے کہ زندگی ایک تحفہ ہے۔

میں اکثر خود سے پوچھتا ہوں کہ شمس سے یہ تحفہ کس نے چھینا؟ پانی کے دیوتا کا سینہ چیر کر دل نکال لوں، جو ہم سے دور دور رہتا ہے؟ آسمان کو الزام دوں جس نے ہم پر برسوں کرم کی نظر نہیں کی یا پھر خود کو مجرم ٹھیراؤں جو چھوٹے بھائی کو سنبھال نہیں سکا؟ آقا کی گردن پکڑوں یا وڈیرے کا گریبان چاک کروں یا پھر ان سب کا پیٹ پھاڑ دوں جن کے گھر تحائف سے بھرے پڑے ہیں؟ کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ کون کون بری الذمہ ہے۔

بیس مئی دو ہزار چودہ عیسوی

تماشائے روزگار

نسرین نے کلائی پر بندھی چھوٹے ڈائل والی گھڑی میں گھومتی سوئیوں کو دیکھا اور نائیلون سے بنی چارپائی پر سوئے ناصر کو کندھے سے پکڑ کر ہلانے لگی۔ کچھ دیر ہلانے پر بھی حرکت نہ ہوئی تو ناصر کے کان کے قریب منہ لے جا کر اِعلان کیا۔

''اُٹھو، جلدی سے دودھ لے کر آؤ۔''

''اچھا۔ اُٹھتا ہوں۔'' ناصر نے دائیں سے بائیں کروٹ لیتے ہوئے بوجھل آواز میں جواب دیا لیکن نسرین نے بازو سے پکڑ کر ہلانا جاری رکھا۔

''کہا نہ جلدی اُٹھو، بچوں نے سکول جانا ہے۔ روز دیر کر دیتے ہو۔''

ناصر مزید جھٹکے سہہ نہ سکا اور جھنجھلا کر اُٹھ بیٹھا۔ اَدھ کھلی غُصیلی نظروں سے نسرین کو دیکھا۔ اُس کے ایک ہاتھ سے برتن، دوسرے سے پیسے لیے اور بُڑبڑاتے ہوئے گھر سے نکل گیا۔

نسرین کو کئی اور کام تھے، وہ ناصر کی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بچوں کی طرف متوجہ ہوئی جو ابھی تیار نہیں ہوئے تھے۔ رمیز پتلون تھامے صحن میں چکر لگا رہا تھا اور فریحہ فراک پر پڑے سیاہی کے داغ کو تکے جا رہی تھی۔ نسرین نے پہلے فریحہ کی فراک کا پلو پکڑ کر سیاہی دھوئی لیکن نشان رہ گیا۔ پھر وہ رمیز کو پتلون پہنانے لگی۔ اِسی دوران میں یاد آیا ابھی چائے کے لیے پانی رکھنا ہے۔ کیتلی میں پانی بھرتے ہوئے سالن کی سڑانڈ نتھنوں تک پہنچی تو نسرین نے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے ہنڈیا اُتار دی۔

نسرین کو گیس کی بندش کا خوف تھا۔ ہاتھ تیز تیز چلانے لگی۔ توا رکھا، پیڑے بنائے اور چپاتی توے پر ڈالنے لگی تو فریحہ بہتی ناک کے ساتھ حاضر ہوگئی۔ نسرین نے چپاتی جلدی سے توے پر پھینکی، فریحہ کی ناک صاف کی اور چپاتی کو پلٹ دیا۔ پھر گھڑی پر نظر ڈالی جس کی تیزی سے گھومتی سوئیوں نے اُس کے ماتھے پر ایک شکن اور بڑھا دی۔ نسرین نے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا اور بے دھیانی سے روٹیاں پکانے لگی۔ روٹیاں پکا چکی تو توا اور کیتلی بھی چولہے سے اتار دی اور ناصر کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ آیا تو خالی ہاتھ ڈول ہلاتا ہوا آیا۔

ہر دوسرے تیسرے دن ناصر دودھ لینے میں ناکام ہو کر گھر لوٹتا ہے تو نسرین کی قوتِ برداشت جواب دے جاتی ہے۔ اُن کے بچے ہیں تو چھوٹے لیکن ہیں بڑے سمجھدار۔۔۔ موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔ نسرین اُن کے غائب ہونے سے پہلے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ ڈبے میں بھر دیتی ہے۔ اِس کے بعد نسرین اور ناصر ایک دوسرے پر دھونس جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔

''آج پھر دودھ نہیں لائے؟'' نسرین ہاتھ قمیص سے پونچھتے، سر کو قدرے اوپر جھٹکا دیتے ہوئے پوچھتی ہے۔

''ختم ہو گیا تھا۔'' ناصر آرام سے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا جس پر نسرین کی ناک مزید پھول گئی۔

''تو کسی اور سے لے آتے۔''

''تین گوالوں کو منہ دکھا آیا ہوں۔ اب کیا پورا شہر پھروں۔'' ناصر تیکھے لہجے میں جواب دیتے ہوئے لیٹ گیا۔

''سارا شہر کیا پھرو گے۔ ایک کام تم سے ہوتا نہیں۔ یونہی چارپائی توڑتے رہو۔'' بچے سکول جا چکے تھے، نسرین کو خفت کا خوف نہیں تھا سو اُس نے حلق کی کمان سے ایک تیر کھینچ کر زبان کے ذریعے ناصر پر چھوڑا جو ٹھیک نشانے پر لگا اور وہ درد سے کراہ اُٹھا۔

''یہ کیا ہر قت طعنے دیتی رہتی ہو۔ تمہاری نوکری کیا لگ گئی۔ میرے پیچھے پڑ گئی۔''

''ہاں میری نوکری لگ گئی۔ تمہاری قسمت جاگ اُٹھی۔ گھر بیٹھے روٹیاں توڑتے رہو۔'' نسرین اِتنا کہہ کراپنے کمرے میں چلی گئی۔ ناصر تِلملاتے ہوئے اُٹھ بیٹھا اور پیچھے سے پانڈیوں کی طرح آواز لگائی۔ ''آٹھ مہینے نہیں ہوئے نوکری پہ لگے اور طعنے دیا کرو آٹھ سو مرتبہ روزانہ۔۔۔ مفت میں روٹیاں۔۔۔ بک بک کرتی ہے۔'' نسرین کی طرف سے جواب نہ آیا البتہ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلی۔ ناصر کواَن دیکھا کرتے ہوئے دروازے تک پہنچی اور کواڑ کھولنے سے پہلے کچھ دیر رکی۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ پھر زور سے دروازہ کھولا اوراس سے زیادہ زور سے بند کر دیا۔ ناصر کو آواز بالکل زناٹے دار تھپڑ جیسی لگی۔ اُس نے تھوڑا سا سر اُٹھایا اور جھٹک کر سو گیا۔

سورج سر پر آیا تو پسینے میں شرابور اُٹھا۔ نہا دھو کر باورچی خانے میں گیا، جو ملا کھا لیا۔ دروازوں کو تالے لگائے اور نوکری کی تلاش میں نکل پڑا۔ اُس کی منزل نائیلون کے دانے بنانے والا کارخانہ تھا۔ پہلے وہ ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا تھا۔ اچھی بھلی نوکری تھی۔ اسی سے مکان بھی بنایا۔ کرسی پر بیٹھ کام کرتا تھا۔ اچھی گزر بسر ہوتی تھی اور گھر والی بھی عزت کرتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے چلنے والی مشینیں آٹھ گھنٹے بھی نہ چل پاتیں اور چھ گھنٹوں پر بھی بل اٹھارہ گھنٹے کا ہی آتا۔ لاگت بڑھ گئی اور پیداوار گھٹ گئی۔ کارخانوں پر تالے پڑنے لگے تو ہنر مند چھابڑی لگاتے یا کہیں ٹھیلہ سجا لیتے۔ سارا دن بک بک کے باوجود پوری نہ پڑتی۔ مزدور سڑکوں پر جوتیاں گھساتے۔ چوراہوں میں بیٹھے تاش کے پتے پھینٹتے اور رات کو گالیاں سنتے۔ روایتی پڑھے لکھے لوگوں کو کام پہلے بھی مشکل سے ملتا تھا۔ اب مرحلے اور بھی دشوار ہو گئے کہ ایک اور جنگ مسلط ہو چکی تھی۔ ناصر بھی دُکان کر لیتا لیکن ڈگریاں رکاوٹ تھیں۔ ایک مرتبہ نوکری کیا چھوٹی، کہیں ٹک کر کام نہ کر سکا لیکن اُس روز نوکری ملنے کی بڑی امید تھی۔

وُہ راستے کی دُھول اور بسوں کا دھواں کھاتے ہوئے کارخانے پہنچا تو پتا چلا کہ اِدھر بھی حالات زیادہ سازگار نہیں۔ بات بات پر ملازم نکالے جارہے ہیں۔ مالک دوسرے ملک جانے کے چکر میں ہے جہاں بجلی، گیس اور پانی سمیت مزدور سستے میں ملتے ہیں اور ٹیکس بھی کم دینا پڑتا ہے۔ یوں تو ٹیکس یہاں بھی امیر آدمی کو کم ہی دینا پڑتا ہے اور غریب کو پانی سے سگریٹ تک ہر چیز پر بھرپائی کرنا پڑتی ہے اور جہاں لوگ چھٹیاں بیتانے بھاگے بھاگے جاتے ہیں وہاں براہ راست امیر کی جیب سے پیسے نکلوائے جاتے ہیں اور غریب پر خرچ کیے جاتے ہیں مگر یہاں گنگا الٹی بہتی ہے سو دال روٹی کا چکر ہی چین لینے نہیں دیتا۔

وُہ بھی بے چینی سے ٹہل ٹہل کر چہرے پر ناکامی کا ٹھپا لگوائے کارخانے سے باہر نکلا تو سوچا کہ اب وقت کیسے کاٹے؟ سو پہلے ایک دوست کے پاس گیا، اِس کے بعد دوسرے اور پھر تیسرے کے ساتھ رونے روتا رہا۔ جب سورج کسی اور جہان کو منور کرنے گیا تو وہ بھی گھر کو ہولیا۔

نسرین باورچی خانے میں بیٹھی ترکاری بنارہی تھی۔ اُس کے چہرے پر کھچاؤ تندیٔ مزاج کا پتا خوب دے رہا تھا۔ ناصر نظر بچا کر بچوں کے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے تھے ہی کتنے اس کے گھر میں۔۔۔ صرف دو۔۔ ایک میں بچے اور دوسرے میں ناصر اور نسرین رہتے۔ پیچھے ایک باورچی خانہ اور غسل خانہ بچتا۔ باورچی خانے میں نسرین بیٹھی تھی۔ غسل خانے میں زیادہ سے زیادہ وہ ایک سگریٹ پی سکتا تھا۔ اپنے کمرے میں جانا نہیں چاہتا تھا، وہاں نسرین سے بار بار ٹکرا ہوتا۔ بچوں کا کمرہ ہی بہتر تھا جو مہمان خانے کا کام بھی دے دیتا۔ فریحہ اور رمیز ایک ہی چارپائی پر بیٹھے کتابوں اور کاپیوں سے کھیل رہے تھے۔ دوسری چارپائی پر ناصر نے قبضہ کرلیا۔

جب سے بے کار ہوا تھا، بچوں نے پیسے مانگنے چھوڑ دیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نسرین کا کمال ہے۔ وہ کچھ دیر بچوں کو دیکھتا رہا۔ پھر دوسری اور کروٹ لے کر بچوں کے

متعلق سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے اسے بھوک محسوس ہوئی جسے کچھ دیر دبانے کی کوشش کرتا رہا لیکن نوکری کی تلاش کی طرح یہاں بھی ناکامی ہو رہی تھی۔ پیٹ بھرا ہو تو دماغ میں اوٹ پٹانگ خیالات آتے ہیں، اگر خالی ہو تو کچھ نہیں آتا جاتا۔ سوچ کے گھوڑے ایک مرکز کے گرد طواف کرتے رہتے ہیں لیکن وہ نسرین کی باتوں کے خوف سے روٹی مانگنا نہیں چاہتا تھا۔

ناصر نے کافی دیر سہانی یادوں سے پیٹ بھرنے کی ناکام کوشش کی مگر زیادہ دیر بھوکا رہنے سے تیزابیت ہونے لگی جسے تھوک کے راستے نکال نہیں پایا تھا کہ سر بھی دُکھنے لگا اور جب پنڈلیوں میں چبھن ہونے لگی تو وہ چارپائی سے اٹھا اور نسرین سے پوچھا۔

''کب تک کھانا تیار ہو جائے گا؟''

''ابھی بنا رہی ہوں۔'' نسرین نے اندر اُٹھتے ابال کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا۔ ذرا جلدی کرو۔'' ناصر چہرے کا اتار چڑھاؤ نظر انداز کر کے غسل خانے کی طرف جانے لگا مگر نسرین کے جواب نے زنجیر ڈال دی۔

''اتنی ہی بھوک لگی تھی تو خود بنا لیتے۔ تم کونسا کام پر گئے تھے۔''

''سارا دن کام ہی ڈھونڈتا رہا ہوں، ناس پیٹی۔'' ناصر نے پتلون کی پیٹی کھولتے ہوئے ترنت جواب دیا۔ اُس کا ایک پاؤں غسل خانے کے باہر اور دوسرا اندر تھا۔

''یہ بہانے کسی اور کو سناؤ۔ کام ڈھونڈ رہے تھے تو ملا کیوں نہیں؟'' نسرین کا سر جُھکا اور آنکھیں اُٹھی ہوئی تھیں۔ وہ دن بھر کی تھکن ناصر پر نکالنے کی پوری تیاری میں معلوم دے رہی تھی۔

''کام ہے ہی نہیں، ملے گا کہاں سے، تمہارے باپ کی دُکان پر؟'' ناصر نے معدے میں موجود مروڑ اُٹھاتی تیزابیت کو زبان کے راستے خارج کیا تو نسرین نے سر بھی

اٹھالیا۔

''اپنے باپ کی زمین پر گھاس کاٹو۔ میرے باپ کی دُکان میں تمہیں کون گھسنے دے گا؟''

ناصر نے غسل خانے والا کام بیچ میں چھوڑا اور نسرین کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ ہری مرچیں ایسے کاٹ رہی تھی جیسے مرچیں نہ ہوں، کچھ اور ہو۔ یوں بے نیازی سے چھری چلاتے دیکھ کر ناصر کا خون کھولتا رہا۔ اُس نے دو تین بار اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ دماغ کو بڑا ٹٹولا۔ پھر ہتھیار ڈال دیے۔

''جلدی کوئی نوکری مل جائے گی۔''

''تم کام کرنا ہی نہیں چاہتے، ورنہ کب کی نوکری مل جاتی۔'' نسرین نے مورچہ نہیں چھوڑا تھا۔

''بتایا تو ہے نوکریاں آسانی سے نہیں ملتیں۔'' ناصر نے باورچی خانے کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگا کر اپنا بوجھ کم کرنے کی کوشش کی۔

''تو پھر مجھے کیسے ملی؟'' نسرین نے آنکھیں پھاڑتے، ناک پھلاتے اور ہاتھ نچاتے ہوئے پوچھا تو ناصر کی بس ہو گئی۔

''پتا نہیں تم نے کیا لچھن دکھائے، جو نوکری مل گئی۔'' ناصر کے الفاظ اتنے ہی خوفناک ثابت ہوئے جتنے ڈرون حملے ہوتے ہیں۔ نسرین کے ہاتھ سے چھری گر گئی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہوئی اور پوری قوت سے ناصر کے دائیں گال پر طمانچہ رسید کر دیا اور دوسرے ہی لمحے ناصر نے دایاں ہاتھ نسرین کے چہرے پر جما دیا جس پر وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ ناصر کو فریحہ کی چیخ سنائی دی جو رمیز کے ساتھ اپنے کمرے کے باہر کھڑی سب دیکھ رہی تھی۔ ناصر نے بچوں کی طرف دیکھا تو وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ نسرین خود کو سنبھالتی ہوئی اُٹھی۔ آنکھوں سے کسیلا پانی بہنے لگا، پونچھنے کی ضرورت نہ سمجھی اور جستی چادر سے بنے ٹرنک

سے آٹا نکال کر چھاننے لگی۔ ٹھوڑی سے چند قطرے غم اور غصے سے کشید شراب بن کر آٹے میں گرنے لگے جیسے پتوں سے اوس گرتی ہے۔

ناصر سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کے پپوٹے ہتھیلی پر رگڑتا، چپ چاپ نسرین کا جھکا ہوا چہرہ دیکھتا رہا۔ تین چار بار بچوں کے کمرے کی طرف بھی دیکھا جس کا دروازہ بند تھا۔ وہ نسرین کا بھیگا چہرہ زیادہ دیر نہ دیکھ سکا اور غسل خانے میں جا اکڑوں بیٹھا اور معدے سے دماغ میں منتقل ہوئی تیزابیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔

نسرین کے چہرے پر لگے تھپڑ کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔ مردانگی کا سوال بھی سر اُٹھاتا۔ نسرین نے اُسے کئی بار بتایا تھا کہ پلنگ توڑ مشق یا مار پیٹ ہی مردانگی نہیں۔ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ کبھی غسل خانے کی دیوار پر مکا مار کر غصہ نکالتا۔ کبھی ماتھے کو زور سے پکڑ کر دباتا کہ سب کچھ نچڑ کر نکل جائے۔ غلط اور صحیح کی پرکھ میں سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا۔ کبھی خود کو قصور وار مانتا اور کبھی نسرین پر سارا ملبہ ڈال دیتا۔ سر پر پانی ڈالتا کہ دماغ ٹھنڈا ہو کر کالا دھواں چھوڑنے والے انجن کی طرح چالو ہو جائے۔ یہ حربہ بھی زیادہ کارگر نہ ہوا تو اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پھر بچوں کے پاس گیا جو سہمے ہوئے تھے، پیار کیا، کچھ پیسے دیے اور گھر سے نکل پڑا۔

ناصر کو گھر سے نکلے تین گھنٹے اور چالیس منٹ ہوئے تو بس نے اسے شیر شاہ سوری کی بنائی سڑک کے ایک چوراہے پر اتار دیا جہاں کھڑے ہو کر چاروں اور دیکھا اور تیزی سے سڑک پار کی اور آبائی گاؤں کو جانے والے راستے پر چل پڑا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ موٹر سائیکل گزرتی تو کچھ دیر کے لیے روشنی ہو جاتی۔ پیچھے سے آتی کار گزرتی تو دھول چھوڑ جاتی۔ سامنے سے آنے والی آنکھیں چندھیا دیتی۔ ایک موٹر سائیکل رکشا آیا اور ناصر کے ہاتھ دینے سے پہلے ہی موٹی باریک آوازیں نکالتا گزر گیا۔

رکشا نظروں سے اوجھل ہوا تو ناصر بھی کچے پر اتر آیا اور اونچے نیچے راستے پر چلتے چلتے

سارا واقعہ ذہن میں گھومنے لگا۔ بچوں کے چہروں پر ڈر نظر آ رہا تھا اور نسرین کا تر چہرہ بھی ساتھ ساتھ تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب ہوا کیسے؟ اور یہ بھی نہیں جان پا رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ اسی الجھن کی سلجھن میں وہ آدھے گھنٹے کی پیدل مسافت کے بعد ایک گھر کے دروازے پر رُک گیا۔ بجلی گئی ہوئی تھی، گھنٹی بج نہیں سکتی تھی۔ تین چار بار دروازہ زور زور سے پیٹا تو چھوٹے بھائی نے کھول دیا اور جھٹ سے گلے لگا لیا۔ اُس کے پیچھے کچھ فاصلے پر ناصر کا ابا بندوق پکڑے کھڑا آنکھوں پر زور دے کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ناصر کو دیکھ ابا کی دونالی کا منہ زمین کی طرف ہو گیا۔ ابا نے صحن میں سوئی اماں کو اُٹھایا جس نے بیٹری سے چلنے والی ٹارچ کی روشنی میں روٹیاں بنا کر دیں جو ناصر صدیوں سے بھوکے کی طرح کھانے لگا۔ وہ کھاتا رہا اور اماں بلائیں لیتی رہی۔ چھوٹا بھائی صبح ملنے کا کہہ کر دوبارہ سو گیا۔ ابا چارپائی پر بیٹھا ناصر کی اچانک آمد کا راز اپنی سفید داڑھی میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا۔

ناصر پیٹ پوجا سے فارغ ہوا تو ابا نے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ اماں بھی کچھ دیر ہوں ہاں کرتی رہی۔ پھر خراٹے سنائی دینے لگے جس کے بعد ابا نے سرگوشیوں میں سوال شروع کر دیے۔ ناصر کے جوابات سے اچانک آمد کا سبب معلوم ہوا تو ابا نے نصیحتوں کا ڈبہ کھول لیا۔ ناصر چپ چاپ سنتا رہا جب تک ابا مشورے دیتے دیتے سو نہ گئے۔

ناصر کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی سوائے ٹڈی کی آواز کے جو بار بار کسی دیوار کی درز سے اپنی موجودگی سے آگاہ کرتی۔ وہ بے چینی کے ساتھ ستاروں بھرا آسمان تکتا رہا لیکن اس کے تارے گاؤں سے دور شہر میں مدھم مدھم سے دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں چاند بڑا چمکدار معلوم دے رہا تھا اور اُس کی چاندنی گاؤں سے دور جس چاند کو تک رہی تھی، وہ اِتنا منور نہیں رہا تھا۔ گرہن لگ گیا تھا۔ آدھی رات ہو چکی تھی اور طرح طرح کے وسوسے گھیرے ہوئے تھے۔ وہ صحن سے اُٹھی اور جا کر فریحہ کے ساتھ چارپائی پر لیٹ گئی۔ اُسے علم

بھی نہ ہوا کہ کب نیند نے اسے آلیا۔

مولوی کے اذان دینے سے پہلے مرغ نے بانگیں دے دیں اور ناصر کی آنکھ کھل گئی۔ اماں اور ابا پہلے ہی اُٹھ چکے تھے۔ بھائی کھیتوں کو پانی دینے جاچکا تھا۔ ناصر چت لیٹا نیلگوں آسماں تکنے لگا، جواس وقت سیاہی مائل تھا اور پھر آہستہ آہستہ سیاہی چھٹنے لگی۔ گلی سے ہلکے اور بھاری قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ صحن کے پیڑ پر چڑیاں بھی چہچہانے لگیں۔ طوطا ٹائیں ٹائیں کرنے لگا اور اسے یکدم محسوس ہوا کہ اس نے عرصہ ہوا طوطا اڑتا، بولتا نہیں دیکھا، نہیں سنا تھا، لالی دیکھ کراس کی آنکھیں پھیل گئیں کہ یہ کیا؟ یہ پیارا سا پرندہ کہاں گم ہو گیا تھا؟ اور جب اس نے منڈیر پر فاختہ دیکھی تو خوشی سے باچھیں کھل گئیں اور وہ کھو گیا ماضی میں جہاں وہ سرسوں کے کھیت میں کھلے پھولوں کے درمیان پرندے اڑا رہا تھا اور وہاں سے واپسی اس وقت ہوئی جب اسے اپنے پھول یاد آئے اور وہ دوبارہ کھو گیا۔

ناصر زیادہ دیر یادوں میں کھویا نہ رہ سکا کہ اماں نے کھانا تیار کرلیا اور اُس نے بڑے دنوں بعد دیسی گھی سے چپڑی روٹی کھائی۔ لسی کا بڑا گلاس پینے کے بعد بڑی سی ڈکار لی اور اماں کی طرف دیکھا جوسب کو کھانا کھلا کر خود کھا رہی تھی۔ ابا حقہ تیار کر رہے تھے۔ ناصر بھی کچھ سوچ کر ابا کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ حقہ تیار ہو چکا تو وہ نال دانتوں میں دابے مرغیوں کو دانہ ڈالنے لگے۔ ناصر کو بات بات پر ٹھکائی کرنے اور گالیاں دینے والے ابا کے پاس بیٹھنا کبھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس وقت عجب سکون مل رہا تھا۔

وہ بچوں کی طرح تجسس سے مرغیوں کو دیکھ رہا تھا۔ مرغیوں کی دانہ چگتے ہوئے نکلنے والی آوازیں کانوں میں رس گھول رہی تھیں لیکن مرغے کے منہ سے نکلنے والی آواز پکے راگ ایسی تھی۔ وہ مرغے کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ مرغیاں دانہ دُنکا پوری ایمانداری سے چُگ رہی تھیں اور مرغا پاس کھڑا ٹک ٹک کیے جا رہا تھا۔ جہاں دانہ نظر آتا، دو چار سُر لگا کر مرغیوں کو بلا لیتا۔ مرغیاں آکر چگ لیتیں۔ وہ کھڑا دیکھتا رہتا۔ خود نہ چگتا۔

ناصر نے ڈبے سے مٹھی بھر کر دانے نکالے۔ مرغے کے قریب جا کر مٹھی کھول دی۔ مرغے نے چونچ سے دانے زمین پر گرائے اور مرغیوں کو بلا لیا۔ ناصر نے مرغیوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر ڈرایا تو مرغا ناصر پر جھپٹ پڑا۔ ناصر پیچھے ہٹ گیا لیکن مرغے نے شور مچائے رکھا۔ مرغے کی جارحیت سے خوش ہو کر ناصر واپس چارپائی پر آ گیا اور ابا سے پوچھا۔

''مرغا کیوں نہیں کھا رہا؟''

''مرغیاں کھا کر فارغ ہوں گی تو مرغا بھی کھالے گا۔''

''اچھا۔ ایسا کیوں؟'' ناصر نے حیرانی سے پوچھا۔

''کیونکہ وہ مرغا ہے اور یہ اس کے اصلی نر ہونے کی نشانی ہے۔'' ابا نے ہنستے ہوئے گلے میں جما ریشہ دھوئیں سے نکالنے کی کوشش کی مگر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ ناصر ابا کو پیچھے سے تھپکیاں دینے لگا اور ابا کے کندھے دیکھنے لگا جواب بھی اس سے چوڑے تھے۔ حقے نے اُن کا کچھ خاص نہیں بگاڑا تھا لیکن اماں نے حقے کو صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔ ابا کی کھانسی رکی تو ناصر پھر مرغے کو دیکھنے لگا۔

ناصر کبھی ابا اور کبھی اماں کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہا اور کبھی بھائی سے کام کاج کے متعلق معلومات لیتا رہا۔ دوپہر ہونے کو آئی تو واپسی کی تیاری کی۔ اماں نے جی بھر کر پیار کیا۔ ناصر سر جھکا کر ابا سے ملا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے چھوٹے بھائی کو دعوت دی۔

''تُو میرے پاس شہر آ جا، پکا پکا۔''

''میرا کھیت کون سنبھالے گا؟'' چھوٹے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اُسے شیر شاہ سوری کی شاہراہ تک چھوڑنے کے لیے ساتھ چل دیا۔

انیس اکتوبر دو ہزار گیارہ عیسوی

کھلے پنجرے کا قیدی

یہ موت کا گولا ہے یا پنجرہ، ایک بہت بڑا پنجرہ، مَیں نہیں جانتا۔ ایک بار مجھے محسوس ہوا کہ یہ موت کا گول گول بڑا سا گولا ہے جس میں مَیں موٹر سائیکل چلا رہا ہوں۔ کبھی گھڑی کی سوئی کی طرح دائیں سے بائیں گھوم رہا ہوں اور کبھی موٹر سائیکل کو آڑھا ترچھا بھگا رہا ہوں۔ یوں اوپر نیچے موٹر سائیکل چلاتے، دائیں بائیں گھومتے میرا دماغ گھوم جاتا ہے۔ میں اِس گھن چکر سے نکلنا چاہتا ہوں مگر سرکس کا مالک کہتا ہے، ''شو پورا کرو۔''

جب مجھے یہ پنجرہ لگتا ہے تب مَیں اِس کی سلاخیں دیکھتا ہوں۔ اِس میں سلاخیں صرف حصار بنانے کے لیے استعمال نہیں ہوئیں بلکہ اندر بھی کئی سلاخیں ہیں، جنہوں نے مختلف خانے بنا رکھے ہیں۔ یہ صنعتی امیروں کا خانہ ہے۔ وہ بڑے بڑے تاجروں کا خانہ ہے۔ اِس میں سرکار کے کماؤ پوت رہتے ہیں۔ اُس میں سرکار خود رہتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی مَیں کہاں رہوں؟ میرے لیے جو خانہ بنایا گیا، یہ رہنے کے لائق نہیں۔ اِس کی سلاخیں گول گول پائپ والی نہیں، چپٹی ہیں اور دونوں طرف تلوار کی سی دھار ہے۔ ان کو پکڑ کر ہلانا چاہوں تو ہاتھ زخمی ہو جائیں۔ ایک خانے سے دوسرے میں جانے کی کوشش کروں تو جسم کا کوئی حصہ گھائل ہو جائے۔ زخمی ہوا تو ہسپتال جانا پڑے گا اور وہاں بھی کئی خانے ہوتے ہیں۔ ایک خانہ اشرافیہ کے لیے ہوتا ہے اور دوسرے کے باہر لمبی قطاریں ہوتی ہیں۔ مَیں اِن میں پھنس گیا تو موت کے گولے میں موٹر سائیکل کون چلائے گا؟

پتا نہیں۔ آگے بولو۔

اکثر سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی تک نہیں بنتا جیسے مجھے ہسپتال سے ڈر لگتا ہے۔ شفاخانہ نہ ہوا قید خانہ ہو گیا، بھئی، ڈر لگتا ہے۔ ابھی چند مہینے پہلے میں نے پنجرے سے باہر جھانک کر دیکھا تو ٹی وی دیکھا اور ٹی وی پر کیا دیکھا کہ پتلے خشک ہونٹوں پر سرخی کا لیپ کیے، گندمی رنگ کو گورا کرنے کے لیے کئی طرح کے پاؤڈر ملے ہوئے کالی لمبی پلکوں والی حسینہ خبریں سنا رہی تھی کہ بہاولنگر کے سرکاری ہسپتال میں چاند کا چکر پورا ہونے سے پہلے پہلے سو سے اوپر بچوں کی زندگی پوری ہو گئی اور کوئی ذمہ دار نہ ٹھیرا۔ خیر اس خبر نے مجھے کچھ خاص نہیں چونکایا۔ مجھے کیا، اور کسی کو بھی جھٹکا نہیں لگا۔ یہاں لوگ مرتے رہتے ہیں۔

اور ایک خبر یہ تھی کہ وہاڑی کے سرکاری ہسپتال میں غلط ٹیکے سے مریض مر گیا اور ڈاکٹر پر مقدمہ ہو گیا اور اُس کے ساتھی کام چھوڑ کر بیٹھ گئے، مسیحا نہ ہوئے منشی ہو گئے۔ بہاولنگر کے ہسپتال میں دوا نے اثر کیا نہ دعا صحیح مقام پر پہنچی لیکن وہاڑی میں تو دہائی پر دہائی بھی کام نہ کر سکی۔ ڈاکٹروں کے منہ میں یوں انگلیاں داب کر ہسپتال کے باہر بیٹھ جانے سے تین بچے ہسپتال کے اندر مر گئے۔ اِس خبر پر کسی اور کو کچھ ہوا ہو یا نہ ہو، مجھے تھوڑا افسوس ہوا۔۔۔صرف افسوس۔ اپنے دُکھ اتنے زیادہ ہیں کہ کسی اور کے لیے دُکھی ہونے کی گنجائش کہاں رہی تھی۔

اچھا۔ آگے بولو۔

یہ تو ہوئیں دوسروں کی باتیں، اب مَیں اپنی بات کرتا ہوں۔

ہاں ہاں کیوں نہیں۔

ایک دن دفتر میں بے دلی سے کام کر رہا تھا گو کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ چھوٹی عید پر تنخواہ ملی تھی اور چند دن بعد بڑی عید تھی۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ تین چار مہینے پہلے ہی میری شادی ہوئی تھی۔ اب آپ خود اندازہ کیجیے کہ میں ذہنی طور پر کہاں تھا اور میرا جسم

کہاں ۔۔۔پنجرے میں یا موت کے گولے میں، جو بھی ہو، دونوں ایک جیسے ہیں لیکن میرا دھیان ان دونوں سے بہت دور تھا کہ میرے موبائل فون پر پیغام کی اطلاع دینے والی مخصوص گھنٹی بجی۔ مَیں نے پتلون کی جیب سے موبائل فون نکالا اور بیگم کا پیغام پایا۔

''آج ہم ہسپتال گئے تھے۔ آپ گھر آئیں گے تو ایک خوشخبری دوں گی۔''

میں جان گیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور پاؤں زمین سے اُٹھنے کو بے تاب ہو گئے لیکن میں نشست چھوڑ نہیں سکتا تھا سو دل لگا کر کام کرنے لگا کہ جلدی ختم ہو اور گھر جا سکوں۔ چند گھنٹے بعد دفتر سے نکلا۔ موٹر سائیکل کی گدی صاف کیے بغیر بیٹھا اور اتنی تیز بھگائی کہ موت کے گولے میں بھی کیا چلاتا ہوں گا۔ گھر پہنچ کر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھنٹی بجانا بھول ہی گیا۔ بیگم نے دروازہ کھولا۔ اُس کے چہرے پر خوشی ناچ رہی تھی جسے میں اپنے دل میں بجتے ساز کا نتیجہ سمجھا اور اُس کے پیچھے پیچھے اپنے کمرے میں آیا اور آتے ہی اُسے دبوچ لیا۔

دلچسپ۔ اور بتاؤ۔

ہمارے گھر میں بھوک نہیں ناچتی تھی لیکن خوشحالی کا رقص بھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم بس ٹھیک تھے مگر بیگم کی خبر سے سب بدل گیا۔ میرے اندر یہ احساس گاجر کے جوس کی طرح خون بڑھانے لگا کہ میں مَیں نہیں رہا۔ میرا ایک اور وجود بن رہا ہے جو مجھ سے بہتر ہوگا۔ اُس کی آمد کے احساس نے قبل از وقت مجھے جکڑ لیا تھا اور اس قید سے زیادہ مسرت مجھے کبھی نہیں ملی تھی۔

دو مہینے اور دس دن میں اِس احساس سے دل کی دھرتی سیراب کرتا رہا۔ پھر پتا چلا کہ میری بیگم کے پیٹ میں کہیں شور گھس گیا ہے جس سے دھرتی بنجر ہونے لگی ہے۔ میں آدھی رات کو معائنہ کرانے ہسپتال گیا جس کی پرچی فیس ایک روپیہ تھی مگر اس کے پارکنگ سٹینڈ پر

موٹر سائیکل کی فیس دس روپے تھی۔ استقبالیہ پر پرچی بنانے والے نے مجھے اس خانے کی طرف روانہ کیا جس کے باہر لکھا تھا۔

''مردوں کا داخلہ منع ہے۔''

میں نے بیگم اور اماں کو اُس خانے میں داخل کیا اور خود باہر انتظار کرنے لگا۔ وہ دو منٹ بعد باہر آ گئیں۔ ڈاکٹر نے مشینی معائنہ کرانے کی چٹ تھما دی تھی۔ ہسپتال کی لیبارٹری میں گئے تو معائنہ کرنے والی مشین خراب تھی۔ ڈاکٹر نے ایک اور خانے کی طرف ہمارا منہ کر کے اس زور سے دھکا دیا کہ ہم سیدھا دروازے پر رکے۔ مجھے پھر باہر روک دیا گیا۔ اب کی بار اماں کو بھی رُکنا پڑا۔ بیگم تھوڑی دیر بعد ہاتھ میں ایک رپورٹ لیے باہر آئی۔ اُس نے آتے ہی بتایا کہ اس خانے کی مشین بھی صحیح نہیں تھی، بس اندازے سے کام چلایا گیا ہے۔

افسوس۔۔۔

ہم اندازے پر مبنی رپورٹ لے کر دوبارہ ڈاکٹر کے کمرے میں گئے تو پتا چلا، وہ کہیں اور جا چکی ہے۔ ہم گھنٹہ بھر انتظار کے بعد گھر لوٹ آئے۔ دوسرے دن صبح صبح ہسپتال گئے۔ ایک بار پھر معائنہ کرانے کے لیے چٹ ملی۔ رپورٹ لانے کے بعد ڈاکٹر نے دوا لکھ دی اور سات دن کھانے کی ہدایت کی۔ ایک گولی روزانہ صبح، دوپہر اور شام کو کھانی تھی اور دوسری گولی دن میں ایک مرتبہ نگلنا تھی۔

دوا لیتے سات دن پورے نہیں ہوئے تھے کہ مرض پھیلتا معلوم دیا۔ چوتھے دن ڈاکٹرنی کے پاس گئے تو اُس نے کہا، ''حالت جتنی بھی خراب ہو، دوا کھاتے جاؤ، سات دن بعد ہی معائنہ کروں گی۔''

عجیب بات ہے۔

خدا خدا کر کے سات دن پورے ہوئے تو ہسپتال گئے۔ مخصوص خانے میں بیٹھی نرس

نے ناک میں گھسیڑی انگلی نکال کر کہا، ''رات کو آئیں۔'' رات کو گئے تو ڈاکٹر کی دوست ملنے آئی ہوئی تھی جسے آدھی رات کو بھی اپنے گھر چین نہیں تھا۔ ڈاکٹرنی پہلے وہیں بیٹھی گپیں ہانکتی رہی، پھر مزید گپیں ہانکنے کے لیے اُس کے ساتھ کہیں چلی گئی اور ہم راہ تکتے رہ گئے۔

یہ تو اور بھی عجیب بات ہے۔

ہاں مگر تم سب ایسے ہی ہو۔ خیر دوسرے روز رات کو ہسپتال گئے تو لیڈی ڈاکٹر نے پھر چٹ لکھ دی۔ معائنہ کرانے گئے تو پہلے سے خراب مشین اور زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ لیبارٹری والے نے صبح آنے کو کہا۔ صبح پہنچے تو مشین میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہسپتال کے باہر ایک لیبارٹری سے معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر کے پاس گئے تو اس نے رپورٹ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس زور سے اڑی کہ جیسے رپورٹ نہ ہو، رشتہ کا پیغام ہو۔

ہم نے ایک سفارشی ڈھونڈا جس کے کہنے پر ڈاکٹر نے دوبارہ چٹ لکھ کر دی۔ سفارشی ہمارے ساتھ ہسپتال کی لیبارٹری میں گیا تو مشین خود بخود چل پڑی۔ معائنہ کرانے کے بعد رپورٹ لا کر ڈاکٹر کو دی۔ اس نے پرانی دوا کھانے کی ہدایت کرتے ہوئے پھر سات دن کے بعد آنے کو کہا۔

سات کا پہاڑا۔۔۔

پہاڑے کو چھوڑو۔ آٹھویں دن ہسپتال گئے تو یہاں بھی ہڑتال چل رہی تھی۔ میں نے جیب ٹٹولی جس میں بتیس سو روپے تھے سو بیگم کو پرائیویٹ ہسپتال لے گیا جہاں سارے ختم ہو گئے۔ نویں دن میرے پاس اس ہسپتال جانے کے پیسے نہیں تھے اور سرکاری ہسپتال میں ہڑتال ختم نہیں ہوئی تھی۔ دسویں دن سرکاری ہسپتال گئے تو میری بیگم لیڈی ڈاکٹر سے ملنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کی لیڈی ڈاکٹر سے تفصیلی بات چیت تین منٹ پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد معائنہ ہوا تو پتا چلا کہ کچھ باقی نہیں رہا۔ وہ، جس نے میرے خواب پورے کرنے

تھے، آنے سے پہلے ہی رخصت ہو گیا تھا۔ اُس کے یوں چلے جانے سے میں اور میری بیوی ایک دوسرے سے آنکھیں چرانے لگے۔ دو تین مہینے ہم ایک دوسرے سے منہ موڑ کر سوتے رہے۔ اس کے بعد وہ ہر رات میرا کندھا ہلا کر فرمائش کرتی۔

''منہ میری طرف کریں۔''

ہوں۔

پھر ہم نے دوبارہ دو سے تین بننے کی کوشش کی جو یہاں آنے تک جاری تھی۔ اب ملا جواب کہ مجھے ہسپتال سے کیوں ڈر لگتا ہے؟''

کافی دیر سے مسلسل بول رہے راشد نے میز کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھے ڈاکٹر حشام سے یوں کہا جیسے چھٹی جماعت کا بچہ ریاضی کا سوال حل کر کے استاد سے ذہانت پر داد کا طالب ہو۔ وہ زیادہ تر چپ رہتا لیکن جب بولنے پر آتا تو روکنا مشکل ہو جاتا۔

''ہاں۔ لیکن تم اب پھر ایک ہسپتال میں ہو۔'' ڈاکٹر حشام نے چشمہ آنکھوں سے اتار کر میز پر رکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو راشد نے ڈاکٹر کو یوں دیکھا کہ آنکھیں تھوڑی میچ گئیں۔ وہ کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا۔ پھر پلکیں اوپر اٹھا کر بولا۔

''ہاں۔ لیکن میں یہاں خود تو نہیں آیا، بھیجا گیا ہوں۔ ویسے بھی یہ ہسپتال نہیں۔ پاگل خانہ ہے۔''

''پاگل خانہ بھی ہسپتال ہی ہوتا ہے۔ تم اپنی بیوی سے اتنی مار پیٹ نہ کرتے تو تمہیں یہاں نہ آنا پڑتا۔''

''ہاں۔۔۔'' راشد نے میز پر ناخن زور سے رگڑتے ہوئے اپنی پریشانیاں صاف کرنے کی کوشش کی۔

وہ ایک معمولی اخبار نویس تھا۔ ایک ماہر منشی کی طرح رات گئے تک خبروں کا حساب

کتاب کرتا۔ ہر چھوٹے آدمی کی خبر بڑی بنانے کی کوشش کرتا اور ایک دن خود خبر بن گیا۔ اُس نے اپنی بیوی کی اچھی خاصی چھترول کر دی تھی جسے ہسپتال داخل کرانا پڑا جہاں وہ کئی دن رہی۔ جب وہ ہسپتال سے نکلی تب راشد کو اندر جانا پڑ گیا۔ اب اسے یہاں رہتے کئی مہینے ہو چکے تھے اور ڈاکٹر حشام اپنے تئیں اُس کی ذہنی حالت جانچ رہا تھا۔

''تمھیں کیا لگتا ہے کہ تم نے اپنی بیوی کو کیوں مارنا شروع کیا؟''

''پتا نہیں۔ شاید بچہ ضائع ہونے کی وجہ سے۔'' راشد کی آواز کہیں دور سے آئی۔

''کیا تمھیں پتا تھا یہ اُس کی غلطی نہیں؟'' ڈاکٹر حشام نے فٹ پوچھا۔

''میرے دماغ کے کسی خانے میں صحیح وجہ موجود نہیں۔ کسی کا غصہ کسی پر نکل گیا۔'' راشد نے میز پر ٹھوڑی ٹکاتے اور بانہیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا تو ڈاکٹر حشام پل بھر کے لیے چونک گیا۔ پھر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے پوچھا۔

''اچھا تمھارے دماغ کے خانے سے یاد آیا، تمھیں کیوں لگتا ہے کہ تم کئی خانوں والے بڑے پنجرے میں ہو؟'' ڈاکٹر حشام نے چشمہ میز سے اٹھا کر شیشے صاف کرنا شروع کر دیے۔

''اس سوال کا جواب میں لکھ کر دینا چاہوں گا۔ مجھے کاغذ پنسل دو۔ کل جواب مل جائے گا۔''

نہیں۔ یونہی بولتے رہو۔

نہیں۔ میں لکھ کر زیادہ بہتر اظہار کر لیتا ہوں۔

''تمھیں پنسل نہیں مل سکتی۔ تم خود کو یا کسی اور کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔'' ڈاکٹر حشام نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔ پھر ایسا کرو، ابھی کاغذ پنسل دو۔ تمھارے سامنے سب کچھ لکھ

دوں گا۔'' راشد کی اس سوچ پر ڈاکٹر کا قہقہہ لگانے کو جی چاہا لیکن کچھ سوچ کر مسکراہٹ تک محدود رہا اور جیب سے پین اور فائل سے کاغذ نکال کر راشد کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ راشد نے فوراً پین پکڑا، اس کا منہ دیکھا جس میں ایک چھوٹی سے گیند تھی جو گھوم گھوم کر پیچھے سے پلاسٹک کے باریک پائپ سے سیاہی خود پر لپیٹ کر کاغذ پر منتقل کرتی ہے۔ راشد نے پین کو جھٹکا دیا اور کاغذ پر جھک کر لکھنے لگا۔ ڈاکٹر حشام اُسے تجسس بھری نگاہوں سے قلم گھساتے دیکھتا رہا۔ راشد نے چند منٹوں میں صفحہ بھر دیا اور کاغذ کا رخ تبدیل کر کے حاشیے کے لیے بچی جگہ بھی پُر کر دی۔ پھر اُس نے کاغذ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اِس عمل کے بعد کاغذ میز پر رکھا، اوپر پین رکھا اور ڈاکٹر کی طرف کھسکا دیا۔ ڈاکٹر نے جب پین پکڑ کر جیب میں رکھا تو راشد چھت کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں تازہ پھری سفیدی پر ہلکے ہلکے میلے حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے ایک نظر اُسے دیکھا اور جواب پڑھنے لگا۔

''میں پنجرے میں ہوں۔ میں پنجرے میں کیوں ہوں؟ یہ سوال زیادہ اہم ہے لیکن یہ آپ کی سوچ سے اوپر کی بات ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ مجھے کیوں لگتا ہے میں ایک اتنے بڑے پنجرے میں ہوں جس کی کوئی حد نہیں۔ میں گھر سے نکلتا ہوں۔ موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے دو تین کلومیٹر بعد کوئی پولیس والا مجھے میری حفاظت کے نام پر روک لیتا ہے۔ طرح طرح کے سوال کرتا ہے۔ کاغذ دیکھتا ہے۔ پھر کمیٹی کھانے والی عورتوں کی طرح دو چار باتیں کرتا ہے جن کا جواب صرف گالی ہوتا ہے جو میں دل میں دے لیتا ہوں۔ اگر کوئی پولیس والا مجھے میری حفاظت کے نام پر نہ روکے تو کہیں نہ کہیں کسی بڑے آدمی کی سواری کے نام پر سڑک بند ہوتی ہے۔ کیا یہ پنجرہ نہیں؟ میری بیوی گھر سے باہر نکلتی ہے تو حریص نگاہیں اسے قید کر لیتی ہیں۔ میں سرکاری ملازم نہیں۔ پرائیویٹ اداروں میں نوکری کرتا رہا ہوں جہاں مجھ سے گدھے کی طرح کام لیا جاتا رہا ہے جیسے غلاموں سے لیا جاتا تھا۔ گھر واپس آتے

ہوئے راستہ بھٹک کر فوج کی بنائی رہائشی کالونی میں گھس جاؤں تو محسوس ہوتا ہے میں کسی اور ملک میں آ گیا ہوں۔ میں یہاں سے نکلنے کے لیے بے چین ہو جاتا ہوں جیسے میں پنجرے کے ایسے خانے میں داخل ہو گیا ہوں جہاں میرا داخلہ ممنوع ہے۔ شارٹ کٹ کے چکر میں افسر شاہی کالونی کی راہ لوں تو ڈرتا ہوں کہ کوئی پوچھ نہ لے، ''ہاں بھئی تیری ہمت کیسے ہوئی ادھر آنے کی؟'' میرا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے وہ لوگ قانون بناتے ہیں جن کے علاقوں میں گھسنا بھی میرے بس سے باہر ہے۔ کیا یہ پنجرہ نہیں؟ گھر میں طرح طرح کی ضروریات دروازہ کھولے میرے اندر آنے کا انتظار کرتی ہیں اور ان سے نمٹتے نمٹتے میری ہمت جواب دے جاتی ہے۔ میرا آزاد ہونے کو جی چاہتا ہے۔ باہر نکلتا ہوں تو عجب افراتفری کا عالم ہوتا ہے۔ ہر کوئی دوسرے کا راستہ کاٹ رہا ہے۔ کچل کر پنجرے سے نکلنا چاہتا ہے۔ کسی نے خود پر سامان تعیش کا خول چڑھا رکھا ہے اور کوئی خود کو کپڑوں میں بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ ہو کیا رہا ہے؟ ہر چوک میں چار پانچ لوگ بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں۔ ان کا گھیرا میرے گرد ایسے ہوتا ہے جیسے پنجرہ ہو۔ مجھے ڈبل ایم اے کرنے کے باوجود سرکار کلرک تک نہیں رکھتی اور ایک میٹرک پاس شخص محکمہ سوئی گیس کا سربراہ بنا دیا جاتا ہے۔ ایسی ناانصافی تو صرف پنجرے میں ہی ہو سکتی ہے۔ جب میں کوئی سچی بات کہنا چاہتا ہوں تو مجھے روک دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی میری پٹائی کر دی جاتی ہے۔ مَیں کچھ کہنے سے ڈرتا ہوں تو کیا یہ پنجرہ نہیں؟ میں کچھ پانے کی جستجو سے ڈرتا ہوں۔ مجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ کھونے کا خوف رہتا ہے اور جب مَیں اِس خوف کے علاج کے لیے جاتا ہوں تو حکم ملتا ہے، ''آج ملاقات کا وقت نہیں۔'' تو کیا یہ پنجرہ نہیں؟ میں ایسے پنجرے میں ہوں جس کا دروازہ کھلا ہے لیکن اس پر دو پہرے دار کھڑے ہیں۔ ایک نے اکڑی ہوئی شلوار قمیص پہن رکھی اور ہر وقت مونچھوں کو تاؤ دیتا رہتا ہے۔ دوسرے نے بدیسی لباس

زیب تن کیا ہوا ہے اور ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی ہے جس کے ایک کونے پر نصب بٹن دبائیں تو دوسرے کونے سے سٹیل کی تیز دھار والی چھری نکل آتی ہے۔"

ڈاکٹر حسام نے تحریری جواب پڑھ کر پریشانی سے ماتھے پر ہاتھ پھیرا، عینک اتار کر میز پر رکھ دی اور راشد پر دھندلی نگاہ ڈالی جو چھت کی سفیدی تکے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ٹھوڑی پکڑ کر چند لمحے راشد کا اوپر اُٹھا ہوا چہرہ پڑھنے کی بھی کوشش کی۔ پھر میز پر رکھی فائل کھول کر کچھ لکھا اور کمرے سے نکل گیا۔ ڈاکٹر کے یوں چپ چاپ چلے جانے سے لاتعلق بیٹھا راشد سفیدی تکتا رہ گیا جس پر میلے حلقے اور بھی نمایاں ہو چکے تھے۔

چھ اکتوبر دو ہزار چودہ عیسوی

نقش

ایم اے کیا تو خالہ نے مجھے ایک موبائل فون تحفہ میں دیا۔ میں آج تک ایسا موبائل فون خود نہیں خرید سکا۔ اس میں دو دو کیمرے تھے، ایک سامنے اور دوسرا پیچھے۔۔۔ انٹرنیٹ کی سہولت بھی تھی اور اِس میں ٹی وی بھی چلتا تھا۔ اگر کیبل کے تار کے نیچے کھڑے ہو کر اس کا انٹینا باہر نکالتا تو بآسانی پچیس سے تیس چینل میسر ہوتے۔ یہ اتنا بڑھیا تھا کہ اس میں چلنے والے ڈرامے محفوظ بھی کیے جا سکتے تھے۔

میں نے پاکستان اور بھارت کے درمیان فضول کھیل کرکٹ کے میچ بھی اِسی پر دیکھے تھے اگرچہ گھر میں ٹی وی بھی موجود تھا۔ اور ایک بات تو بتانا بھول ہی گیا کہ اس میں ریڈیو بھی تھا۔ اگر کوئی بندہ خصوصاً بندی فون کرے تو اُس کی آواز ریکارڈ بھی کی جا سکتی تھی۔

میرا چھوٹا بھائی بھی اِس سے کھیل لیا کرتا تھا۔ میں رات کو فون سرہانے کے نیچے رکھ کر سوتا مگر وہ چپکے سے آتا اور موبائل فون یعنی سمارٹ فون اٹھا کر چلتا بنتا۔ پھر وہ اس کے ساتھ کیا کیا کرتا، کچھ پتا نہیں۔ وہ اِسے فون کی طرح نہیں، کھلونے کی طرح استعمال کرتا تھا اگرچہ اس کے پاس اپنا فون تھا۔

میں نے اِس پر جو پہلا کام کیا، وہ تھا اک چاند چہرہ کو فون کرنا۔۔۔ پھر اُسے برقی پیغام بھی بھیجا۔ میں اس کی آواز ریکارڈ کرتا اور تنہائی میں بار بار سنتا۔ اِس کو کمپیوٹر کے ساتھ منسلک کر کے چاند چہرہ کی تصاویر منتقل کرتا تھا۔ اور تو اور اسی کی تصویر موبائل فون کی چھوٹی سی

سکرین پر سجا رکھی تھی۔ یہ فون اُس رخسار دائم بہار کو بھی بہت پسند آیا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ رکھ لو لیکن وہ نہیں مانی، عجب لڑکی تھی اور اس سے بھی عجیب یہ کہ وہ صرف فون کے لیے انکار نہیں کرتی تھی۔

بس جی کیا بتاؤں کہ اِس فون سے کیا کیا دل بستگی تھی لیکن یہ ضرور بتاؤں گا کہ اسی سے فیس بک کا آغاز کیا تھا اور پہلی بات جو اسی برقی پلیٹ فارم پر کی تھی، وہ میری نہیں تھی، اور وہ بات یہ تھی کہ ہم زندگی کا متوازن نقشہ ترتیب دینے میں یکسر ناکام رہے ہیں، لکیر کے فقیر بنے رہے ہیں۔

اُن دنوں میں شملہ پہاڑی کے قریب نیا نیا نوکری پر لگا تھا جو اسی گیسو دراز کی طرح عجب تھی جسے صرف انکار کا پہاڑا آتا تھا۔ خیر اُس کا کیا مذکور جس نے قابلِ ذکر نہ سمجھا، تو میں ساری رات کام کرتا اور صبح سے سہ پہر تک سوتا رہتا تھا۔ رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے ہر وقت تھکاوٹ اور نیند کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں تنخواہ کا حال بتانے کے لائق نہیں لیکن بتانا بھی ضرور ہے کہ تنخواہ تھوڑی سی تھی اور ملنے میں بڑی دیری کرتی تھی اُسی کی طرح جس کا ذکر مَیں اب نہیں کروں گا۔

انہی دنوں میں سے ایک روز رات کو دفتر سے گھر جا رہا تھا کہ گڑھی شاہو کا پل چڑھنے سے پہلے ایک درخت کے سائے میں کھڑے چھ فٹ سے نکلتے قد والے شخص نے ہاتھ دے کر مجھے روک لیا اور اپنے تئیں ڈراؤنے انداز میں، جو میرے لیے نہایت مضحکہ خیز تھا، پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''کیوں؟'' میں نے جھنجھلا کر پوچھا لیکن اُس نے درشتی سے کہا، ''جتنا پوچھا ہے۔ اُتنا بتاؤ۔''

اِس باراُس کی بھاری بھرکم آواز نے میرے سر پر کوئی دو من سے زیادہ وزن ڈال دیا اور میں فوراً سمجھ گیا کہ معاملہ سنگین ہے۔

''گھر جا رہا ہوں۔''

''گھر جا کر کیا کرو گے؟'' وہ تفتیشی معلوم دیا۔

میں نے بے زاری سے کہا: ''گھر جا کر کھانا کھاؤں گا اور پھر سو جاؤں گا۔''

''میں نے بھی کھانا کھانا ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''تو ٹھیک ہے۔ تم بھی جا کر کھانا کھاؤ، میں بھی جاتا ہوں۔'' میں نے جبریہ شائستگی کا مظاہرہ کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔ تم تو نہیں جا سکتے۔ کیا تم ہسپتال جانا چاہتے ہو؟''

''ہسپتال نہیں جانا چاہتا تو پہلے پوچھ رہا ہوں۔'' میں لاشعوری طور پر اچانک مؤدب ہو گیا۔ بعد میں مجھے حیرانی ہوئی کہ اُس وقت مجھے ہوا کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اب کچھ لے دے کر جان چھوٹے گی ورنہ کم سے کم چوٹ آ سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ جان جا سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں میں سے کچھ بھی نہ ہو کیونکہ اُس کا انداز الجھا دینے والا تھا۔

''اچھا تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟''

''ایک سو۔۔۔''

''نکال کر دکھاؤ۔'' اُس نے میری بات کاٹ دی اور میں نے نکال کر دکھا دیے جو پورے ایک سو چالیس روپے تھے۔ اس نے سو روپے کا نوٹ پکڑ لیا اور شانِ بے نیازی دکھاتے ہوئے باقی مجھے رکھنے کے لیے کہا جس پر میں دل ہی دل میں مسکرایا کہ کیا سخاوت ہے۔ بعد میں جب بھی کسی کو یہ بات بتائی، اس نے بھی قہقہے لگائے۔

''اچھا۔تمہارے پاس موبائل فون کونسا ہے؟''

میرا دل زور سے دھڑ کا گو یہ سوال غیر متوقع نہیں تھا۔اُن دنوں چوری تو کیا، راہزنی بھی عام تھی اور اب تک ہے۔دن ہو یا رات، ڈاکوؤں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔حالات ہی ایسے بنا دیے گئے ہیں کہ آدمی آدمی نہیں رہے۔پڑوسی ملک عرصہ دراز سے طاقتور ملکوں کے لیے اپنی مہارتوں کی مشق گاہ بنا ہوا تھا جس کے واضح اثرات یہاں پڑتے رہے ہیں اور ایک پوری نسل ایسی تیار ہو چکی ہے جو صرف بندوق چلانا جانتی ہے۔اسے کچھ اور سکھایا ہی نہیں گیا تو وہ اور کیا کرے؟ جنہوں نے کچھ اور سیکھا، انھیں کرنے کے لیے جگہ نہیں دی جاتی۔

ایک وقت وہ بھی آیا جب پڑوس سے جنگ گھسیٹ کر اپنے گھر میں لائی گئی حالانکہ بڑے بوڑھوں سے یہی سنا کہ جنگ جیتنا اچھی بات ہے مگر جنگ کو گھر سے دور رکھنا کمال ہوتا ہے اور یہ کمال کوئی اور کرتا رہا ہے جس کی ٹانگیں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں اور گھر میں امن ہوتا ہے، کارخانے چلتے ہیں، مال بکتا ہے مگر ہمارا گھر تو ان گھروں میں ہے جہاں اُس کے سبز قدم پڑے۔

امن وامان عنقا ہو تو کاروبار کہاں بچ پاتا ہے، کاروبار ٹھپ ہو تو کارخانے کیا کریں؟ کارخانے کچھ نہ کریں تو روزگار کہاں سے ملے؟ اور زراعت کی ایسی تیسی تو مسلسل ہوتی رہی ہے اور اتنی ہو چکی کہ کسان درانتی چھوڑ کر کدال سنبھال چکا ہے۔یہ ایک المیہ ہے۔رہی سہی کسر یوں پوری ہوتی ہے کہ افسر شاہی ہو کہ نوکر شاہی یا پھر قانون ساز اداروں میں بیٹھے چغد، سب اپنی جیبیں بھرنے میں مصروف رہتے تھے، اب تک ہیں اور تب تک رہیں گے جب تک وہ آگے بڑھ کر بند نہیں باندھتے جو بھکاری بننے پر مجبور بنا دیے گئے، چور اُچکے بنا دیے گئے، اور انسانیت کے درجہ سے کہیں نیچے گرا دیے گئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنا آپ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے بیچنے لگے کیونکہ اُنہیں کوئی راستہ نظر نہیں آتا حالانکہ راستہ

سامنے ہوتا ہے۔

میں خود سے اکثر پوچھتا ہوں کہ یہ راستہ جو سامنے ہوتا ہے، نظر کیوں نہیں آتا؟ اور اگر آتا ہے تو اس پر چلا کیوں نہیں جاتا؟ یہ ایک گتھی ہے اور اِسے سلجھانے کے بجائے سبھی نے محتاط رہنے میں بھلائی جانی سو میں بھی احتیاط برتنے لگا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا اپنے تئیں بندوبست کر کے نکلتا تھا اور اُس دن بھی میں نے موبائل فون بنیان کے اندر رکھا ہوا تھا۔ تنخواہ بھی اِسی طرح بنیان کے اندر چھپالیتا چونکہ بنیان پتلون کے اندر گئی ہوتی ہے اور اوپر سے پیٹی نے پتلون کو اچھی طرح کسا ہوتا ہے، یوں ہر چیز محفوظ رہتی ہے اور دیکھنے والے کو محسوس بھی نہیں ہوتا سو میں نے موبائل فون کے سوال پر ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''میرے پاس فون نہیں ہے۔''

''نکلا تو میرا؟'' اُس نے اس قدر اعتماد سے کہا کہ مجھے شبہ ہوا کہیں میرے کسی دفتری ساتھی نے مخبری نہ کی ہو؟ میں ''ہاں'' اور ''ناں'' کی کشمکش میں پڑ گیا، مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا لیکن وہ سب سمجھ گیا۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ پتلون میں اڑسے پستول پر رکھا جسے شرٹ کے نیچے چھپایا گیا تھا اور حکم دیا۔

''نکال کر دکھاؤ۔''

میں نے خاموشی سے تعمیل کی تو اُس نے موبائل فون ہاتھ میں پکڑتے ہی کہا، ''واہ! دو کیمرے والا۔ اس میں تو ٹی وی بھی چلتا ہے۔'' میں حیران رہ گیا کہ اُس نے اچھی طرح دیکھے بغیر کیسے یہ سب کہہ دیا۔ یوں تو اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں لیکن یہ اُن وقتوں کی بات ہے جب فون ابھی نیا نیا تھا اور کسی کسی کے پاس ہوتا تھا۔ بہر حال اُسے اصل چیز مل گئی تھی لہٰذا میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''سمیں تمہارے کسی کام کی نہیں۔ میں لے لوں؟''

''ہاں، ٹھیک ہے، جلدی۔'' اُس نے فون مجھے پکڑایا، میں نے سمیں نکالیں اور موبائل فون بچانے کی ایک اور کوشش کی۔

''یار ہم غریبوں کو لوٹنے کا کیا فائدہ، امیروں کی گردن پر ہاتھ ڈالو تو کچھ ملے بھی۔''

''ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن یہ ایک مسئلہ ہے۔ اب تم جاؤ۔''

''کیا فون واپس نہیں مل سکتا؟'' میں نے دوبارہ کوشش کی تو اس نے سر دائیں بائیں ہلا دیا اور اچانک مجھے کندھے سے پکڑ کر ایک طرف کو دھکا دے دیا۔ میرا دل پھر زور سے دھڑکا اور تیز رفتار ٹرک کو دور جاتا دیکھ کر شکر بجالایا کہ بچ گیا ورنہ کیا بچتا۔ میری سانسیں ابھی بحال نہیں ہوئی تھیں کہ وہ بولا۔

''ان سے بچ کر رہو۔ کوئی لاش بھی نہیں اٹھاتا۔''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن ایسی بات بھی نہیں۔ دنیا میں اچھے لوگ ختم نہیں ہوئے۔''

''کیا مطلب؟''

اب ہم فٹ پاتھ پر کھڑے ہو چکے تھے اور اندھیرے میں ڈوبی کوٹھی کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔

''میرا چھوٹا بھائی ایک دفعہ تانگے اور رکشے کے تصادم میں زخمی ہو گیا۔ تانگے اور رکشے والا دونوں غائب ہو گئے۔ میرا بھائی وہیں سڑک پر پڑا رہ گیا۔ ایک اور رکشے والا گزرا اور تھوڑی دور جا کر واپس آیا۔ اُس نے میرے بھائی کو اپنے رکشے میں لٹایا۔ اُس کی سائیکل پیچھے باندھی اور ہسپتال لے گیا۔ پیر کا ایکسرے کرایا، پٹی کرائی، ٹیکا لگوایا، اور گھر چھوڑ کر گیا تھا۔ ابا نے اُسے پیسے دینے کی بڑی کوشش کی مگر اُس نے نہیں لیے کہ روپے دے کر نیکی ضائع نہ کریں۔''

''واہ جی واہ۔ سبحان اللہ۔''

''مزے کی بات سنو۔ ایک دن رکشے والا بھی سڑک پر پڑا تھا۔ بے ہوش۔ کئی گھنٹے پڑا رہا تھا۔ کسی نے اُٹھایا نہیں تھا۔ پولیس کا ڈر تھا شاید۔۔۔''

''یہ پولیس والے بھی۔۔۔''

''اور ان کو ایسا بنانے والے بھی۔۔۔ اچھا۔ تو میں چلتا ہوں۔''

''ہاں۔ جاؤ۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ اتنی رات کو آ کہاں سے رہے ہو؟'' اُس کے چہرے پر پھر وہی مسکراہٹ پھیل گئی جو پہلے پراسرار تھی اور اب مانوس سی لگ رہی تھی۔

''دفتر سے۔۔۔''

''کون سا دفتر؟ کہاں ہے یہ دفتر؟''

''یہ اخبار کا دفتر ہے۔''

''اچھا۔ کتنا پڑھے ہو؟''

''ایم اے کیا ہے، اردو میں۔۔۔''

''ہوں۔ انگریزی میں کرتے تو اچھا ہوتا۔'' اُس نے قہقہہ لگایا تو میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''انگریزی میں بھی کیا ہے۔''

''اچھا۔ تو پھر سائیکل پر کیا کر رہے ہو؟'' اُس نے حیرانی سے پوچھا تو میرے ذہن میں زندگی کے متوازن نقشے کی بات آئی مگر کہی نہیں اور اُس سے سوال کیا۔

''تمہاری تعلیم کیا ہے؟''

''میں نے بھی ایم اے کیا ہے۔''

''کس میں؟''

''انگریزی۔۔۔''

میں نے فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے اُس کی بات کاٹ دی اور وہ جھنجھلا گیا۔ اُس نے دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میری ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ پھر وہ بھی قہقہے لگانے لگا اور جب نقشے کے نقش پر زیادہ ہنسنے سے ہماری آنکھیں نم ہوگئیں تو اُس نے چند لمحے خاموش رہ کر، جیب میں ہاتھ ڈال کر، موبائل فون اور سو روپے کا نوٹ نکالا، فون مجھے پکڑا دیا اور کچھ سوچ کر نوٹ دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

اٹھائیس مارچ دو ہزار گیارہ عیسوی

بابا نان چک

بِلے شیر فروش کی دکان میں ٹی وی سے صدا آ رہی ہے۔

"اور یاد کرو تم سے پہلے کتنی قومیں تباہ ہو گئیں کیونکہ وہ انصاف نہیں کرتی تھیں۔"

رمضان کا مہینہ اور سحری کا وقت ہے۔ دہی خریدنے والوں کا رش لگا ہوا ہے۔ دُکان ایوب نے شروع کی تھی اور اب بیس سال بعد اس کا بیٹا بلا بیٹھتا ہے لیکن دہی اب تک کھٹے کا کھٹا۔۔۔ اِتنے برسوں میں باپ بیٹا دہی کی ترشی ختم نہ کر سکے۔ دُکان کے باہر پڑے لکڑی کے بنچ پر بیٹھے جانو ملنگ کے چہرے پر مسکراہٹ جمی ہوئی ہے۔ وہ ردی کاغذ کے دستے پر لکی نمبر نکالنے میں مصروف ہے اور ہلکے ہلکے کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ گلے میں اُس کے موٹے منکوں والی تسبیح ہے جس کے اندھیرے میں چمکنے والے دانوں کو کالی ڈوری میں بندھی اونٹ کی ہڈی جانو کے آٹا گوندھنے کی مانند آگے پیچھے ہونے سے چھو رہی ہے۔ سر پر کروشیے کی سفید ٹوپی ہے جیسے مسجد جانے کے لیے تیار بیٹھا ہو۔ اُس کے کپڑے بھی سفید ہیں مگر لگتے نہیں۔ سر کے بال بڑھے ہوئے اور گچھو مچھو ہیں۔ مونچھیں تیکھی مگر داڑھی غائب ہے۔ دائیں کان میں لٹکتی بالی کافی بڑی ہے۔ ناک میں بھی پلاسٹک کی دو سفید بالیاں ہیں جن میں سے ایک چھوٹی اور دوسری بڑی ہے۔ جانو کے گھٹنے کے ساتھ نانچکو کے دستے ترازو کے پلڑوں کی طرح برابر لٹک رہے ہیں۔

جانو ملنگ صرف اسی بنچ پر نہ بیٹھتا تھا بلکہ اس پندرہ فٹ چوڑی گلی میں کہیں نہ کہیں مل

جاتا جواب سڑک کا منظر پیش کرتی ہے اور ہر وقت مصروف نظر آتی ہے۔ جانو اس کی مصروفیت سے بے پروا کبھی چھیدے چائے فروش کے تھڑے پر بیٹھا ملتا ہے یا کبھی یاسر پکوڑے والے کی دکان کے باہر بیٹھا اپنے حصے کا انتظار کرتا پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے اَبا کے گھر کبھی کبھار نظر آتا، جو اسی سڑک نما گلی سے ملحق ایک چھوٹی سی گلی میں تھا اور اب چھوٹے بھائی کی ملکیت ہے۔

وہ مشہور تو ملنگ ہے لیکن اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ کس وقت یاسر کی دکان کے باہر ڈیرہ ڈالنا ہے، کب چھیدے سے گالیاں سننی ہیں، بِلے سے دہی لینے کے لیے کتنا انتظار کرنا ہے اور موتی کیسے نان چنے دے گا۔ وہ سارا دن اِدھر اُدھر بیٹھ کر رجسٹر پر گول دائرے بنا کر ان میں نمبر لکھتا رہتا ہے جو ماننے والے اسے کچھ نہ کچھ دے کر لے جاتے ہیں۔

رات کو کسی دُکان کے باہر لیٹ کر آنکھیں بند کر لینا اس کا معمول ٹھیرا ہے۔ اَبا جب تک زندہ رہا اسے پکڑ پکڑ کر گھر لے جاتا، وہ گزرا تو یہ ڈیوٹی ماں دینے لگی۔ اَبا تو پھر برا بھلا کہہ لیتا تھا لیکن اماں نے کبھی کچھ نہ کہا البتہ کبھی کبھی جانو کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر کر آنسو بہا لیتی تھی اور وہی کسیلا پانی جانو کی آنکھوں سے بھی نکلا جب اماں منوں مٹی تلے سونے چلی گئی۔ اس کے بعد بھائی نے بھی سنبھالنے کی زحمت کی لیکن گھر والی کی باتیں زیادہ دن برداشت نہ کر سکا اور جانو ملنگ کے نصیب میں تھڑے لکھے گئے جن پر وہ سردیوں کی راتیں دان میں مِلی مَیلی کُچیلی چادر اوڑھے اپنے بالوں کی طرح گچھومچھو ہو کر گزارتا اور گرمیوں میں وہی چادر بِلے کی دُکان پر جمع کرا دیتا۔ بِلا اس پر مہربان نہیں لیکن ایوب کے خیال میں وہ اللہ لوک ہے جو دعا دے تو پو بارہ اور بد عا دے تو تینوں کانے۔۔۔ ویسے بھی ایوب اور جانو کا ابا ایک ساتھ پلے بڑھے تھے۔

جانو کے ہم عمر کہتے ہیں کہ جانو اُس وقت ملنگ بنا تھا جب اس کی بیوی ولیمہ کے روز

ہمیشہ کے لیے میکے چلی گئی تھی۔ جانو کا ایک پرانا یار بتاتا ہے کہ اسے کراٹے سیکھنے کا جنون تھا۔ وہ کمرے میں گھس جاتا اور دروازہ بند کر کے بروس لی کی طرح آوازیں نکال نکال کر نانچکو چلایا کرتا تھا۔ ایسے ہی کسی روز نانچکو گھوم کر اس کی کھوپڑی کو لگا اور کوئی حصہ نرم پڑ گیا ۔ دماغ کا کوئی حصہ نرم تھا یا نہیں، یہ بات بڑے ڈاکٹر ہی بتا سکتے ہیں اور جانو کے ابا کی پہنچ چھوٹے ڈاکٹروں تک رہی لیکن یہ بات پکی ہے کہ جانو شادی سے پہلے اچھا خاصا کماؤ پوت تھا۔ بہنوں کا جہیز اُسی کی کمائی پر بنا تھا جو کبھی کبھار میکے آئیں تو بازار سے گزرتے ہوئے اسے رُک کر دیکھتی ہیں اور آنکھیں پونچھ کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ اُنھیں اپنا چھ فٹ سے نکلتے قد والا بھائی یاد آ جاتا ہے جس کے ہوتے کسی شے کی کمی نہ ہوتی تھی مگر اب وہ کہیں کھو گیا تھا۔

ایک روزہ بیاہ کے بعد سب بدل گیا تھا۔ وہ تنہائی ڈھونڈ ڈھونڈ کر روتا اور اپنے گناہ ٹٹولتا تھا مگر اس کے اپنوں کی زبانیں دراز ہو گئی تھیں اور غیروں کی تو ہوتی ہی شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہیں۔ لوگ شروع شروع میں طعنے دیتے تو وہ غصے سے بھر جاتا، زبان کھینچ لینے کی کوشش کرتا لیکن جلد ہی اُسے چُپ کا دورہ پڑ گیا اور پھر اُس کے چہرے پر سدا بہار ہنسی سج گئی جو اس وقت بھی بِلے کی ناگواری سے بے پروا کِھل رہی ہے اور قہقہے میں تب بدل جاتی ہے جب بِلا سارے گاہک بھگتا کر نہ چاہتے ہوئے بھی پیالے میں دہی دیتا ہے جسے جانو لسی سمجھ کر غٹا غٹ پی کر بنچ سے اٹھتے ہوئے بڑبڑاتا ہے۔

''اج صاب نوں ملنا اے۔ تنخواہ دا ٹیم اے۔ تیرا کم ہو جائے گا۔'' اور رجسٹر کو بغل میں دبا کر نانچکو چابی والے چھلے کی طرح لہراتے ہوئے بڑے بڑے قدم اٹھانے لگتا ہے۔ وہ بڑی گلی سے ہوتے ہوئے بلور شاہ کے مزار کو جانے والے راستے پر چل رہا ہے اور تھوڑی دیر پہلے ٹی وی پر سنے ہوئے الفاظ دہرا رہا ہے۔

''اور یاد کرو تم سے پہلے کتنی قومیں تباہ ہو گئیں کیونکہ وہ انصاف نہیں کرتی تھیں۔''

بلور شاہ کا مزار جانو کی اُس وقت بھی منزل تھا جب وہ کنکوے اُڑایا کرتا تھا کہ یہ مزار راجہ شیر سنگھ کی اجڑی بارہ دری کے احاطے میں ہے اور محلّہ بھر کے بچے ماضی کے حکمران سے لاعلم، شناخت سے محروم، یہاں کھیلتے کودتے تھے۔ پھر یہاں ایک ہسپتال بن گیا جہاں دُور دُور سے لوگ دھکے کھانے کے لیے آتے ہیں کیونکہ اس شہر میں سرکاری ہسپتال آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ ہسپتال کے ساتھ بچی جگہ پارک کو ملی ہے جس کی دوسری طرف معالجین کے لیے رہائشی عمارت بنا دی گئی ہے اور رہی سہی کسر قبضہ مافیا نے لگ بھگ دو سو مکان بنا کر پوری کر دی ہے۔ شفا خانے کے عقب میں طبی طلبہ کے لیے قیام گاہ بھی ہے۔ اب بارہ دری کا نام رہ گیا ہے یا ماضی کی غزل اور حال کے شہرِ آشوب کی وہ نشانی جس کی نوک پلک یونیسکو کی معاونت سے سنوارنے کی کوشش کی گئی جبکہ قریب ہی بارہ دری اور اس کے احاطے سے دوگنا قطعہ اراضی خالی پڑی رُوڑی کا کام دے رہی ہے۔ ایک کچرا گھر بارہ دری کی بغل میں بھی بنا دیا گیا ہے جس سے سرکار کو آمدن ہوتی ہے۔ اس بارہ دروازوں والے اجڑے محل اور مزار کے درمیان لوہے کا ایک بڑا گول بنچ ہے جہاں جانو بیٹھ کر خود سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ جانو اکیلا نہیں ہوتا یہاں اور بھی کئی بے گھر اس کی تنہائی کے ساتھی ہیں کہ پاس ہی غسل خانے بھی بنے ہوئے ہیں لیکن ان بے گھروں میں سے کئی ایسے ہیں جو نشئی بنا دیے گئے۔ جانو نشہ نہیں کرتا مگر اپنے بازار میں نہ ہو تو یہاں ہوتا ہے جیسے اب اپنی سڑک نما گلی سے چلتا آ رہا ہے۔ جب کوئی قریب سے گزرتا ہے تو جانو ملنگ اونچی آواز میں کہتا ہے۔

''حق۔ اج صاب نوں ملنا اے۔ تیرا کم ہو جائے گا۔''

جب وہ پلے کی دُکان اور مزار کے درمیان موجود مسجد کے سامنے پہنچتا ہے تو نظر اٹھا کر سنگ مرمر میں لپٹے گنبد کو دیکھتا ہے اور دوبارہ ''حق'' کا نعرہ لگا کر قدم بڑھاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزار پر حاضری دے یا غسل خانے میں گھس کر تن کا بوجھ ہلکا کرے، اُسے تین شیر

جوان روک کر تلاشی لیتے ہیں۔ جسم پر ہاتھ پھرنے سے جانو کی ہنسی نکل جاتی ہے۔ ایک گھبرو جھنجھلا کر نا نچکو چھین لیتا ہے اور اپنے ساتھیوں سے پوچھتا ہے۔

''ایدھا کیہ کرنا اے؟''

دوسرا شیر جوان کہتا ہے، ''جان دے، ملنگ اے۔ اید ھے کولوں کی لبھنا اے۔''

پہلا گھبرو دوبارہ بولتا ہے، ''ایویں جان دیواں۔ ماما ہس انج رہیا اے جیویں لطیفہ سنیا سو۔''

''ایتھے پچھلے ہفتے جیہڑی واردات ہوئی سی، اید ھے تے پا دیواں؟ سارے ہاسے نکل جان گے۔'' اب کی بار تیسرے جوان کی آواز کالے ناگ کی طرح لہراتی ہے تو جانو ہپ ہپ کرنے لگتا ہے اور اسے دیکھ کر دوسرا شیر جوان جانو کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگاتا ہے۔

''کہیا سی نا ملنگ اے۔''

جانو سر جھکا کر چلنے لگتا ہے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے مزار کے سامنے پہنچ جاتا ہے۔ وہ آج خلافِ معمول عقیدت سے جھکنے کے بجائے صرف ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا ہے اور بائیں ہاتھ بنے غسل خانوں میں سے ایک میں گھس جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلتا ہے اور ہاتھ صاف کرنے کے لیے پشت پر پھیرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھتا ہے جہاں سے واپسی پر اس کی نظریں معالجین کے لیے بنی بلند و بالا رہائشی عمارت سے ٹکراتی ہوئی مزار کے سبز گنبد پر جلتے برقی قمقمے پر جا ٹھیرتی ہیں لیکن وہ جلدی سے آنکھیں پھیر لیتا ہے اور لوہے کے بنچ پر جا بیٹھتا ہے۔ پہلے سے موجود ملنگ اسے ایک بار نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں اور اپنے حال میں مست ہو جاتے ہیں۔ جانو کچھ دیر قریب بیٹھے انسانوں کی طرف دیکھتا ہے جو ملنگ مانے جاتے ہیں یا جنہیں جہاز کہا جاتا ہے، پھر اچانک بنچ پر

کھڑے ہو جاتا ہے اور ہلے شیر فروش کی دُکان میں ٹی وی سے آنے والی صدا اس کے لبوں پر آ جاتی ہے۔

''اور یاد کرو تم سے پہلے کتنی قومیں تباہ ہو گئیں کیونکہ وہ انصاف نہیں کرتی تھیں۔''

جانو خاموش ہوتا ہے تو ایک ملنگ ترنگ میں آ جاتا ہے، 'توں کیتا نہ میں کیتا تے ہور کرے کون؟' کا نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے دھمال ڈالتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے ملنگ بھی اُس کے گرد جھومنا اور نعرہ دہرانا شروع کر دیتے ہیں مگر بنچ پر کھڑا جانو تصویر بن جاتا ہے۔

انتیس جون دو ہزار پندرہ عیسوی

قطرے میں سمندر

''صلاح الدین احمد! تُم بڑے کرپٹ ہو۔ کرپشن میں سب تمہارے بچے ہیں۔
نہیں۔سب نہیں۔ میں کچھ بھی نہیں۔ میں صرف ایک قطرہ ہوں، حقیر قطرہ جو سمندر میں گم
ہو گیا مگر جدا ہونے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ کیا میرا سمندر سے باہر کوئی وجود ہوگا؟ کئی بار
سوچا۔ جواب نفی میں ملا تو میں کیا کرتا۔ وہی کیا جو سب کرتے ہیں۔نہیں۔ چند نہیں بھی
کرتے۔ مجھے بھی اُن میں شامل ہونا چاہئے تھا۔''

دیوار گیر گھڑی پر کالی چھوٹی سوئی چار سے تھوڑا آگے تھی اور بڑی سوئی تین پر پہنچنے کی
کوشش کر رہی تھی۔ ننھے سے برقی قمقمے نے رات کی تاریکی کو کمرے میں گھسنے سے روک رکھا تھا
اور باسٹھ سالہ صلاح الدین اپنے اندر کہیں چل رہی اندھیرے اجالے کی کشمکش کے سبب سو نہیں
پا رہا تھا۔ رات کے دو بجے اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ تب سے آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا
تھا لیکن نیند کہیں دور چلی گئی تھی۔ جہازی سائز پلنگ پر بچھے نرم گدے پر گرم لحاف اوڑھے اُس
کی بیوی رشیدہ احمد گہری نیند میں تھی۔ وہ کبھی رشیدہ کو پہلو بدلتے دیکھتا اور کبھی خواب گاہ کی
دیواریں دیکھتا جن پر نیا نیا رنگ کیا گیا تھا۔ یہ کوئی سستا پینٹ نہیں تھا کہ بدبو سے نیند خراب
ہوئی ہو۔ یہ تو خوشبودار ہے اور یہ خوشبو بھی بعض دفعہ اذیت کا باعث بن جاتی ہے۔

جب سورج اپنی تمازت سے رشیدہ کی سرد پڑتی ہڈیوں میں جان ڈالتا ہے تو وہ بھی
باغیچے میں کرسی پر بیٹھ کر فیضیاب ہوتا ہے لیکن اِس وقت آدھی رات کو باغیچے میں جانا تو دور،
کمرے سے منسلک غسل خانے میں جانا بھی عذاب ہے۔ صلاح الدین خود کو مجبور پاتا ہے
کہ بستر پر ہی جما رہے اور شور مچاتے خیالات کو اپنا کام کرنے دے۔ اُس نے دیوار پر

نصب بڑی سکرین والے ٹی وی سے ذہن بھٹکانے کی کوشش کی لیکن کوئی پروگرام ڈھنگ کا معلوم نہ دیا۔خبروں والے چینل ہوا کے دوش پر ہوا میں اُڑتی اُڑتی خبریں دے رہے تھے اورانہی چینلوں پر بیٹھے دانشور ایسی بقراطی جھاڑ رہے تھے کہ صلاح الدین خود کو احمق محسوس کرنے لگا۔ ریموٹ کا بٹن دباتے دباتے ایک چینل پر شناسا چہرہ نظر آیا تو ہاتھ رک گیا۔ دانشور دوست کہہ رہا تھا۔

''انسان کی ہر خطا معاف ہوسکتی ہے لیکن دوسرے انسان سے زیادتی نا قابل معافی ہے۔'' صلاح الدین نے یہ جملہ سن کر ریموٹ کا بٹن دبا دیا اور ہنستے ہنستے خود کلامی کی۔

''کتنا رنگ باز ہے۔اپنے ملازموں کو تنخواہ دو دو مہینے بعد دیتا ہے اور لوگوں کو انسانیت سکھا رہا ہے۔''

ایک وقت تھا جب صلاح الدین کو اپنے سوا سب احمق لگتے تھے حتیٰ کہ اماں کی باتیں بھی جوانی میں احمقانہ معلوم پڑتی تھیں۔ یہ تب کی بات ہے جب وہ نیا نیا سرکاری افسر بھرتی ہوا تھا۔ صلاح الدین نے مقابلے کے امتحان میں نمبروں کا ڈھیر لگا دیا تھا اور اُسے محکمہ کسٹم میں تعینات کیا گیا تھا۔اُس نے کچھ عرصہ دریا میں رہ کر مگرمچھوں سے بیر کی کوشش کی اور ایک دن ہتھیار ڈال دیے جب اُس نے سوچا تھا کہ ''جب کام میرے بغیر چلتے رہنا ہے تو کیوں نہ میں ہی کرلوں۔''

وہ ایک سکول ماسٹر کا لڑکا تھا جسے عید کے عید نئے کپڑے ملتے تھے اور پھر ایک وقت آیا کہ نئے نئے ملبوسات سے الماریاں بھر گئیں۔اُس کی امی پھر بھی تہوار کے تہوار کپڑے بناتیں اور اُس کے ساتھ بھی نہ رہتی تھیں۔وہ چھوٹے بیٹے جمال کے ساتھ مقیم تھیں جو ابا کے نقشِ قدم پر چل کر سکول ماسٹر بن چکا تھا۔صلاح الدین نے کئی بار ماں سے کہا تھا،'' امی! آپ میرے ساتھ رہا کریں۔ میرا لاہور میں بہت بڑا گھر ہے۔ ہر چیز ہے۔ ہر وقت نوکر حاضر ہوں گے۔ یہاں کام بھی خود کرنا پڑتے ہیں اور یہ گھر بھی کتنا چھوٹا ہے۔'' اُس کی اماں ہر بار مسکرا دیتی تھیں،''بیٹا! تُو اِسی چھوٹے سے گھر میں پلا بڑھا اور جمال کے ساتھ مجھے کوئی تنگی نہیں۔قریب ہی تیرے ابا بھی دفن ہیں۔''

صلاح الدین کی دو کنال کی کوٹھی تھی اور رہائشی بھی دو ہی تھے جو ایک کمرے میں سما جاتے۔ ایک وہ اور دوسری رشیدہ۔۔۔ رشیدہ احمد جوانی میں بڑی کڑک عورت تھی۔ صلاح الدین شام کو جلدی گھر لوٹ آتا اور رشیدہ کے ساتھ کمرے میں گھس جاتا تھا۔ دوسرے دن صبح سویرے انگڑائیاں لیتے نکلتا تھا لیکن باپ نہ بن سکا۔ کسی میں کوئی نقص بھی نہ تھا۔ صلاح الدین نے شادی کے دس سال بعد بھی پھول نہ کھلنے پر دوسری بار سہرا سجانے کے متعلق سوچنا شروع کیا لیکن رشیدہ جو بعد میں رشی کہلانے لگی، بڑی کڑک عورت تھی۔

وہ بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا اور اس کا جی چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔ نوکر سوئے ہوئے تھے۔ رشیدہ بھی خراٹے لے رہی تھی اور اگر جاگ رہی ہوتی تو بھی اِس وقت چائے نہ بناتی۔ اُس نے یادوں کی تجوری کھولی اور دیکھا کہ ماسٹر نظام الدین پراٹھے پکا رہے ہیں اور چودہ سالہ صلی چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہا ہے اور اماں چائے کے قطرے گرتے دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے مسکرا رہی ہیں۔

صلاح الدین نے بھی کئی بار چائے بنائی تھی۔ انڈا بھی فرائی کر لیتا تھا لیکن جب سے وڈا افسر بنا تھا، اس کی دنیا بدل گئی تھی کیونکہ وہ خود بدل گیا تھا۔ ’’ہاں۔ اگر میں نہ بدلتا تو کیا ہوتا؟‘‘ یہ سوال وہ اکثر پوچھتا۔ یہ بات اس نے اپنے ایک سینئر سے بھی پوچھی تھی جس نے بتایا تھا کہ اہم سیٹ پر رہنا ہے تو کمائی کرنا پڑے گی، اپنے لیے، دوسروں کے لیے۔ صلاح پر عمل کرتے ہوئے صلاح الدین نے بہت کمائی کی۔ اتنا کمایا کہ خرچ کی جگہ نہ ملتی لیکن اب اِس عمر میں اُسے سب کچھ عجیب سا معلوم دیتا تھا۔ کوئی وارث ہوتا تو سوچ شاید مختلف ہوتی لیکن اب تو وہ اپنے اشیاء سے بھرے مکان کو دیکھتا تھا اور ابا کا زندگیوں بھرا گھر یاد آ جاتا تھا جہاں اماں سارا دن جمال کے بچوں سے کبھی کھیلتی اور کبھی ڈانٹتی دکھائی دیتی تھیں۔

وہ کبھی سال چھ مہینے بعد راستہ بھول کر اماں سے ملنے جاتا تو واپسی پر طبیعت مکدر ہو جاتی۔ وہ گھر پہنچ کر رشیدہ کو دیکھتا اور پھر سے ماں یاد آ جاتی تھی۔ رشیدہ ماں باپ کی نہیں، اُس کی پسند تھی اور اُس نے عمر بھر اپنی پسند کی ہر پسند کا خیال رکھا لیکن پچاس کا سن پار ہونے

کے بعد سب بدل گیا۔ ہمہ وقت کسی شے کے کم ہونے کا احساس دامن گیر رہنے لگا۔ اکثر راتیں ایسی سوچوں میں گزر جاتیں کہ کیا فائدہ اتنا کچھ ہونے کا؟

اُس نے ایک نظر رشیدہ کے بال دیکھے جنہیں وہ بڑے اہتمام سے کلر کراتی رہتی تھی۔ پھر اُس نے اپنے سر پر انگلیاں پھیریں جو بالوں سے زیادہ جلد کو چھو کر لوٹ آئیں اور اُس کی سوچ دوبارہ اڑان بھرنے لگی۔

''زندگی بھر یہی سمجھتا رہا کہ ہر شخص کی کامیابی میں محنت ہی کارفرما ہوتی ہے لیکن کچھ چیزیں واقعی جدوجہد پر منحصر نہیں ہوتیں جیسے کسی نالائق شخص کا بڑی کرسی پر بیٹھنا اور لائق لوگوں کا گلیوں میں جوتے گھسانا، لذت سے سرشار راتوں کے باوجود اولاد نہ ہونا یا پھر پودوں کا روز پانی، ہوا اور روشنی ملنے کے باوجود مرجھا جانا، صحرا میں نخلستان کا وجود اور آبشار میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کا بڑے پتھروں کے ساتھ ٹکے رہنا۔۔۔ کچھ چیزیں دسترس سے باہر ہوتی ہیں اور کچھ تک عقل کی کمند پہنچ نہیں پاتی جیسے میرا صاحبِ اولاد نہ ہونا۔'' رشیدہ نے کروٹ بدلی تو اُس نے بوجھل نگاہوں سے رشیدہ کے چہرے میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

''شاید یہ میری بداعمالیوں کا نتیجہ ہے لیکن میں زیادہ برا انسان تو نہیں۔ میں نے کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ پیسے کمانا خاص بری بات نہیں۔ پنج ستارہ ہوٹلوں کے باہر روز شام کو گاڑیوں کی قطار داخلے کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ اگر دس گاڑیاں داخلی دروازے کے باہر کھڑی ہیں تو ان میں سے نو کی نمبر پلیٹ سبز ہوتی ہے۔ ان پر سیاسی عہدوں کے ٹھپے نہیں ہوتے۔ یہ میرے جیسے بیوروکریٹ ہوتے ہیں جن کی تنخواہ مہینے میں ایک بار پنج ستارہ ہوٹل پہنچا سکتی ہے۔ پھر یہ گاڑیاں روز کیوں اندر جا رہی ہوتی ہیں؟'' صلاح الدین نے تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے آدھی انگڑائی لی، ٹانگیں لحاف سے نکال کر لٹکائیں اور ننگے پاؤں قالین پر رکھتے ہوئے گھٹنوں پر ہاتھوں سے دباؤ ڈال کر کھڑا ہو گیا، مڑ کر دیکھا کہ کہیں رشیدہ کی آنکھ تو نہیں کھل گئی؟ پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا کمرے سے نکلا، سیڑھیاں اتر کر باورچی خانے میں گیا اور کچھ دیر بعد ہاتھ میں چائے کا بڑا مگ لیے نکلا۔ سیڑھیاں چڑھ کر

کمرے میں آیا اور پلنگ پر بیٹھ کر ریموٹ سے ٹی وی چلا دیا۔ آواز بہت ہلکی رکھی۔ ریموٹ پر ننھے منے بٹن دباتے دباتے انگریزی فلم والا چینل آیا تو اُس کا ہاتھ رک گیا۔ صلاح الدین نے ریموٹ میز پر رکھا اور مگ اٹھا کر چسکیاں لیتے ہوئے بھاپ میں کھو گیا۔

''ہر آدمی دو نمبری کرتا ہے۔ میرے مالی سے لے کر مجھ سے اوپر تک، چھابڑی فروش اور ٹھیلے والے بھی کچھ کم نہیں۔ ایک وقت تھا کہ میرے پاس کھٹارا سی موٹر سائیکل ہوتی تھی جس کا موبل آئل بدلوانے جاتا تو مکینک کا شاگرد موبل آئل انجن میں تیزی سے ڈالتا جاتا اور آخر پر تیل کا ڈبا ڈھکن بند کر کے رکھ لیتا۔ یہ ڈبا وہ بعد میں بڑی گیلن پر لگی کیپ میں الٹا کر دیتا اور ڈبے کے ڈھکن برابر بلکہ اُس سے زیادہ تیل نکلتا۔ اس طرح وہ ایک دن میں پتا نہیں کتنے ڈبے تیل بچاتا اور بعد میں کسی کی موٹر سائیکل کے انجن میں ڈال دیتا۔ جب میرے پاس موٹر سائیکل نہیں تھی تب رکشا والے کو بیس کا نوٹ دیتا اور وہ پانچ کا سکہ نہ ہونے کا بہانہ کر کے سارے دبا لیتا اور ہاں پہلی تنخواہ لینے کے لیے بھی ایک کلرک کو رشوت دینا پڑی تھی۔ مجھے تو ڈومیسائل بنوانے کے لیے بھی اضافی پیسے خرچ کرنا پڑے تھے تو پھر میں کیوں نہ کماتا؟'' صلاح الدین نے بڑے آرام سے مگ واپس میز پر رکھ دیا اور ٹی وی پر نظریں گاڑ لیں لیکن کوئی منظر اسے متاثر نہیں کر رہا تھا۔ دماغ اپنی مصروفیت کے سبب فلم سے کوئی سگنل موصول نہیں کر رہا تھا۔ وہ زندگی کے جائزے میں ایسا ڈوبا تھا کہ نکل نہیں پا رہا تھا۔ یونیورسٹی دور کی انقلابی تقریریں یاد آ رہی تھیں جو عملی زندگی میں ہوا ہو گئیں۔

''ہم بھی کیا کیا سوچتے رہے۔ دوستوں کا گروہ بنا کر سماج سدھار مہم چلانے کی تدبیریں الٹی ہو گئی تھیں۔ انگریزی فلمیں دیکھ دیکھ کر پر تشدد رویہ اپنانے کے منصوبے بنتے اور دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ گورکی کی تحریریں پڑھ پڑھ کر جذباتی ہو جاتے۔ موپساں کے افسانے سینہ جلا دیتے اور چیخوف کی کہانیاں رلا دیتیں۔ ماؤزے تنگ کو یاد کرتے جس نے انقلاب کی راہ میں اپنا بیٹا قربان کیا تھا۔ بھگت سنگھ بھی نہیں بھولا تھا اور دلا بھٹی جیسے سپوت بھی کبھی آئیڈیل رہے تھے۔ ملنگی کا راج یاد آتا لیکن ۔۔۔ لیکن گلا پھاڑ پھاڑ کر سسٹم

کے خلاف نعرے لگانے پر اکتفا کرنے لگے جو معنی سے جدا ہو چکے تھے۔ اور میں سسٹم کا حصہ بنا اور اپنے سوا کچھ نہ بدل سکا۔"

اس کے چہرے پر زہر خند مسکراہٹ پھیل گئی مگر وہ بہاؤ میں بہتا رہا۔

"جامعہ کی راہداریوں پر چلتے چلتے چینی نظام سے مثالیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائی جاتیں کہ کیسے وہ کرپٹ لوگوں کے سینوں میں شگاف کرتے ہیں اور باقیوں پر اثر پڑتا ہے مگر کرپشن ختم نہیں ہو پاتی، کم ضرور ہوتی ہے۔ سعودی عرب میں سر دھڑ سے الگ کیے جاتے ہیں مگر لوگ نشیلے کاروبار سے باز نہیں آتے۔ ہاں سزا سے اثر پڑتا ہے لیکن سزا ہی کافی نہیں۔ اور کیا ہوسکتا ہے؟ معلوم نہیں۔ نگرانی ہونی چاہیے۔۔۔ سخت نگرانی مگر ہر آدمی پر ایک بندہ نہیں بٹھایا جاسکتا۔ خدا نے دو دو فرشتے بٹھا دیے، اب ہم کیسے دو دو بندے لگا سکتے ہیں۔ پہلے جو لگائے ہیں وہ خود حصہ مانگتے ہیں۔ شاید سزا ہی ٹھیک ہے۔ کاش مجھے بھی سزا ملی ہوتی لیکن مجھے سزا دینے والے تو میرے شریک کار تھے۔ ہاں میں اکیلا قصوروار نہیں۔ یہ سسٹم ہی ایسا ہے۔" صلاح الدین نے خود کو تسلی دی۔

ٹی وی بے کار میں چل رہا تھا اور چائے کا بڑا مگ خالی ہو چکا تھا۔ وہ آنکھیں مل رہا تھا مگر نیند نہیں آرہی تھی۔ رشیدہ کے خراٹے کبھی تیز ہو جاتے اور کبھی ہلکے۔۔۔ جیسے صلاح الدین کے خیالات میں تغیر تھا۔ یہی صورتحال نوکری کے آغاز پر تھی اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی۔۔۔ اُسے ہر دوسری تیسری رات کو بے خوابی کا سامنا کرنا پڑتا، آنکھیں نیند سے خالی ہوتیں لیکن دماغ میں خیالات کی ریل پیل رہتی حالانکہ وہ رفقائے کار میں سب سے شریف آدمی مشہور تھا۔ شاید یہ شرافت ہی تھی جو اسے کمزور دیکھ کر دبا رہی تھی یا اُس کے ابا کا نظریاتی ہتھوڑا تھا جو لوہا گرم جان کر ضرب لگا رہا تھا۔ ابا اکثر کہا کرتے تھے، "بیٹا، سکون اُسے ہی ملتا ہے جو اپنا کام صحیح کرتا ہے۔ سکون باہر سے نہیں آتا، یہ اندر ہوتا ہے۔"

"وہ کیا خوب کسی نے کہا تھا کہ غربت خدا کی دین نہیں، یہ انسان کی پیداوار ہے۔ میرا بچپن بھی غربت میں گزرا۔ لڑکپن بھی امیرانہ نہ تھا اور جوانی تو ماں باپ پر ویسے ہی بھاری

تھی ۔ پھر بھی میں اُس وقت کتنا اچھا تھا۔ میری سوچ اچھی تھی۔ اپنی آدھی روٹی میں سے نصف بانٹ دینے کو تیار رہتا تھا لیکن جب پوری روٹی ملی تو چوتھا حصہ بھی دینا گوارا نہیں کیا۔ خیر ایسی بات بھی نہیں کہ میں ساری روٹی خود ہی کھانے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ بس ذرا مصروف ہو گیا تھا اور نہ میں اتنا برا بھی نہیں۔ اگر میں نے کئی جیبیں خالی کرائی ہیں تو کئی بھری بھی ہیں۔ اللہ توبہ بھی کرتا رہا ہوں۔ دیگیں بانٹتا رہا ہوں۔ کرپشن کی کمائی سے ہی سہی ۔۔۔''

اُسے یکا یک پیاس محسوس ہوئی۔ زبان کسیلی کسیلی ہوگئی، پانی پی کر بھی کڑواہٹ نہ گئی اور اُس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''ہاں۔ میں صلاح الدین ولد نظام الدین بڑا کرپٹ ہوں۔ کرپشن میں کئی میرے بچے ہیں لیکن میں اکیلا قصوروار نہیں۔ یہ سسٹم ہی ایسا ہے اور میں تنہا سسٹم نہیں بدل سکتا تھا۔ اِسے بدلنے کے لیے سب کو اپنا آپ بدلنا پڑے گا۔''

صلاح الدین کی آواز اتنی بلند تھی کہ رشیدہ کی آنکھ کھل گئی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بند بھی ہوگئی۔ صلاح الدین نے چند لمحے اُسے دیکھنے کے بعد بستر پر لیٹے لیٹے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا۔ بیڈ کے ساتھ نصب بٹن دبا کر بتی بجھائی، رشیدہ سے لپٹ کر آنکھیں بند کر لیں مگر آوازیں اٹھتی رہیں۔

''ہر آدمی کرپٹ نہیں ہوتا۔ یہ محض پراپیگنڈا ہے اُن کا جو لوٹ مار کرتے ہیں۔ یہ صرف بہانہ ہے ان کا جو ہجوم میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کبھی تہجد کے وقت پھاوڑا اُٹھائے کھیتوں کو جاتے سنہرے بدن دیکھو جو سورج ڈھلے واپس آتے ہیں، وہ تمہارے لیے اناج اُگاتے ہیں اور خود ترستے، سسکتے مرجاتے ہیں اور مقروض قلقاریاں چھوڑ جاتے ہیں۔ کبھی اینٹیں بناتے اور توڑتے وجود دیکھو جن کی زنانیوں کی آنکھیں اُن کی چھتوں سے زیادہ ٹپکتی ہیں، کبھی بوریاں ڈھوتے دو ٹانگوں والے چھکڑے دیکھو جن کو ہر موڑ پر گالیاں ملتی ہیں مگر آخری غسل کے لیے پانی نہیں ملتا، پو پھٹنے سے پہلے گلیوں میں جھاڑو دینے والوں کو دیکھو جو تمہاری پھیلائی گندگی صاف کرتے، افیون کی گولی، چرس بھرے سگریٹ کے دھوئیں، نسوار کی چٹکی اور جان لیوا گولیاں ملے کڑوے پانی میں دُکھ گھولتے، گیس بھرے گٹروں میں اتر

جاتے ہیں، رگوں میں خون منجمد کرتی سردی میں بھٹی کے سامنے پگھلتے، جوتیاں گانٹھتے ننگے پاؤں، لکڑی کاٹتے، رندا چلاتے زخمی ہاتھ، سان پر خود کو گھساتے، شوکر زدہ کندھوں پر مزدوری کا بوجھ ڈھوتے، مشینوں میں انگلیاں کٹواتے، صاف ستھرے بیچ کر گلے پھسے پھل کھاتے، کالی شلوار کو ترستے، ڈھول پیٹتے، گھنگرو بجاتے، بچوں کو کھلونوں کے بجائے باتوں سے پچکارتے۔۔۔اور۔۔۔اور۔۔۔باہر نکلو اور دیکھو، مجھے دیکھو، اپنے باپ کو دیکھو، بھائی کو دیکھو، پھر بھی سب کرپٹ نظر آئیں تو یہ بھی دیکھو کہ کس نے کیسے کرپٹ بنایا اور کیوں بنایا؟ صلی بیٹا آنکھیں کھولو، اپنی اور دوسروں کی۔ اور اگر تُم آنکھیں نہیں کھولنا چاہتے تو نہ کھولو مگر بزدلوں کی طرح بہانے مت بناؤ۔۔۔"

"ابا جی! بس کردیں۔ بس کردیں۔ میں بزدل نہیں، کمزور ہوں۔ طاقت اور ذہانت کے میلاپ سے بدلاؤ آتا ہے۔ میں کمزور ہوں۔ احمق نہیں۔"

صلاح الدین کی بڑبڑاہٹ سے رشیدہ کی آنکھ پھر کھل گئی اور اِس بار فوری بند نہیں ہوئی۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے جلدی جلدی اُٹھی، سائیڈ ٹیبل ٹٹول کر عینک پہنی اور صلاح الدین کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ بولے جا رہا تھا، بولے جا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں احمق ہوں۔ میں آپ کو ہارا ہوا آدمی کہتا تھا۔ اب دیکھیں کون ہارا ہوا ہے؟"

"باپ ہارے یا بیٹا۔ ایک ہی بات۔۔۔"

"صلی اُٹھو، صلی اُٹھو، کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" رشیدہ نے بازو سے پکڑ کر جھنجھورا تو صلاح الدین ہڑبڑا اُٹھا اور اپنے گال چھو کر حیران رہ گیا۔ رشیدہ پوچھتی رہی۔ "کیا ہوا؟ کچھ تو بتاؤ؟" لیکن وہ خاموش رہا اور کچھ دیر بعد "کچھ نہیں" کہہ کر دوبارہ لیٹ گیا، آنکھیں بند کر کے رضائی اوڑھ لی۔ رشیدہ حیران تھی، پریشان تھی اور رضائی کی طرف دیکھ رہی تھی جو قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی۔

نو جنوری دو ہزار پندرہ عیسوی